معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ اسّی روپے (۸۰)

فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے (۲۰۰)

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس (۲۰) پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس. ایم کالج اسٹریچن روڈ. کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں. بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوا

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے. اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا.

• خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں.

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی.

کمیشن ۲۵٪ ہوگا. رقم پیشگی آنی چاہیے.

جلد ۱۶۶ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۱ھ مطابق ماہ اگست ۲۰۰۰ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

ملک میں وحشت، بربریت، درندگی اور خوں ریزی آئے دن کا معمول بن گئی ہے لیکن ۲ اگست کو کشمیر میں ایک ہی وقت میں تشدد، خوں ریزی، بے رحمی اور درندگی کے بڑے لرزہ خیز اور بھیانک واقعات پیش آئے، ابھی تک پورا ملک اس دل دوز حادثہ پر اداس اور غم زدہ ہے، تقریباً ۱۰۰ افراد کی قیمتی جانیں گئیں، سب سے زیادہ اندوہ ناک اور کربناک واقعہ پہلگام میں پیش آیا جس میں امرناتھ یاتریوں کے لنگر کیمپ پر حملہ کرکے متعدد افراد کو ہلاک کر دیا گیا، ان واقعات کی مذمت پورے ملک میں کی گئی، ہر طبقہ کے لوگوں نے ان پر غم و غصہ کا اظہار کیا، مسلمانوں کی تمام اہم جماعتوں اور سرکردہ افراد نے بھی کشمیر میں بے گناہ اور بے قصور افراد کے مارے جانے پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا اور کیوں نہ کرتے، اس طرح کی سنگ دلانہ اور بے رحمانہ حرکت اسلامی تعلیم کے بالکل منافی ہے، کشمیر کے جنگجو گروپ نے بھی ان واقعات کی مذمت کی ہے اور پاکستان کو بھی اس پر ناراضگی ہے، حزب المجاہدین کا کہنا ہے "کہ کوئی اسلام پسند گروہ یہ کام نہیں کر سکتا، نہتے اور بے قصور کو ہلاک کرنا اسلام میں سخت ممنوع ہے" ہم بھی کشمیر کے واقعات کی پُرزور مذمت کرتے ہوئے حکومت سے یہ مطالبہ بھی کرتے ہیں کہ جو افراد اور تنظیمیں ان میں ملوث ہوں ان کو سخت سے سخت سزا دی جائے لیکن جن لوگوں کا تعلق ان واقعات سے دور قریب کا نہ ہو ان کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنا کر پریشان نہ کیا جائے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس طرح کے سنگین معاملات میں خواہ مخواہ تحقیق کے بغیر ہی ہندوستان کے مسلمانوں کو ملوث کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حد ہوگئی ہے کہ عیسائیوں کے قتل اور ان کے گرجاؤں کے جلائے جانے کا الزام بھی انہی کے سر منڈھا جارہا ہے، اگر عام لوگ غیر ذمہ دارانہ اور اشتعال انگیز بیان دیں تو حکومت کا فرض ہے کہ ان کے خلاف سخت اقدام کرے مگر وہ تو خود اس طرح کے واقعات کا رخ بڑی چابک دستی سے مسلمانوں کی طرف موڑ دیتی ہے، ہمارے وزیر داخلہ کو اس میں بڑی مہارت ہے، کشمیر میں ہونے والے واقعات کی صحیح تحقیق و تفتیش، اصل اسباب اور واقعی مجرموں کا پتہ لگانے کے بجائے اٹکل پچو بیانات دئے جارہے ہیں جن سے فائدہ اٹھا کر ہندوؤں کی جارحانہ تنظیموں نے بھارت بند کے دوران فرقہ وارانہ ماحول گرم کیا اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کی مہم چلائی، چنانچہ کشمیر کے واقعات کے بعد گجرات اور بعض دوسری جگہوں میں فرقہ وارانہ فسادات ہوگئے، جن میں چند بے گناہ مسلمان جاں بحق ہوئے، کشمیر میں جو کچھ ہوا اس سے ہر امن پسند کی طرح ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو

سخت صدمہ ہوا اور وہ اس کی انتہائی مذمت کر رہے ہیں، جیسے جیسے دن گزرتے جارہے ہیں ویسے ویسے اصل حقائق سامنے آتے جارہے ہیں جن سے حکومت کے موقف کی تردید اور مسلمانوں کی بے گناہی ثابت ہوتی جارہی ہے، اس لئے فسادات میں بے احتیاطی اور غفلت و غیر ذمہ داری سے جن لوگوں کی جانیں گئی ہیں ان پر حکومت کو شرمندہ اور ہلاک ہونے والوں کے ورثہ کو معقول معاوضہ دینا چاہئے۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی ترقی کے مراحل برابر طے کر رہی ہے، اس کو زمین حاصل ہو چکی ہے جس پر تعمیرات کا کام جاری ہے، یونیورسٹی کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس کے وائس چانسلر پروفیسر محمد شمیم جیراجپوری بڑے متحرک، فعال اور علمی و انتظامی صلاحیت والے شخص ہیں، اس کے دوسرے ذمہ دار اور کارکن بھی لائق، محنتی اور کارگزار ہیں، اب یونیورسٹی میں روزی روٹی سے جوڑنے والے کورسز کی تیاری بھی شروع ہوگئی ہے، اردو یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طلبہ کے روزگار کی منصوبہ بندی اور ان کے مستقبل کو یقینی اور بہتر بنانے اور ان کے لئے ملازمت کے مواقع میں زیادہ سے زیادہ اضافے کے لئے قومی سطح کا ایک اجلاس ۱۲ اگست کو ہوا جس میں مشہور ماہرین تعلیم نے اہم اور دور رس نتائج کے حامل فیصلے کئے، یونیورسٹی نے رواں تعلیمی سال ۲۰۰۰-۱ء میں حسب ذیل کورسز میں داخلے کا اعلان کیا۔

۱۔ بی۔اے، بی کام، بی۔ایس سی سال اول فاؤنڈیشن کورس ۲۔ سرٹیفکیٹ کورس برائے غذا و تغذیہ ۳۔ سرٹیفکیٹ کورس برائے کمپیوٹنگ ۴۔ سرٹیفکیٹ کورس برائے اہلیت اردو بذریعہ ہندی ۵۔ سرٹیفکیٹ کورس برائے اہلیت اردو بذریعہ انگریزی۔

ہم کو امید ہے کہ اردو کو فروغ دینے کے لئے قوم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا مکمل تعاون کرے گی، پراسپکٹس اور درخواست فارم وغیرہ اس پتے سے منگائے جائیں: ڈائرکٹر ڈسٹنس ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، ڈیلکس کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد 500008۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے نئے تعلیمی سال کے لئے قرض وظیفے جاری کرنے کے واسطے ان مسلم طلبہ و طالبات سے درخواستیں طلب کی ہیں جنھوں نے دسواں درجہ کم از کم ۶۰ فی صد، بارھواں ۵۵ فی صد، گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن ۵۰ فی صد نمبروں سے پاس کیا ہو، جن طالب علموں کے نمبر اپنی اپنی ریاستوں میں درخواست دینے والے طلبہ میں سب سے زیادہ ہوں گے، صرف ان ہی کو اکتوبر ۲۰۰۰ء میں کسی وقت سوسائٹی کے خرچ پر دہلی بلایا جائے گا، دو دن قیام کے دوران ان کا انگریزی اور جنرل نالج میں امتحان اور انٹرویو لیا جائے گا، اس کے بعد ہی وظیفوں کا فیصلہ ہوگا، میٹرک پاس کو ۲۵۰، انٹر پاس کو ۳۵۰، گریجویٹ کو ۵۰۰ اور پوسٹ گریجویٹ کو ریسرچ کے لئے

۲۰۰ روپے ماہانہ وظیفہ دیا جاتا ہے، وظیفے کے حق دار کو ایک بانڈ بھر کر دینا ہوگا کہ تعلیم مکمل کر لینے کے زیادہ سے زیادہ دو سال کے بعد سے قرض وظیفہ کی رقم وہ ماہ بہ ماہ ان ہی قسطوں میں واپس کرنا شروع کر دیں گے جن قسطوں میں وہ ان کو ملی تھیں، اس اسکیم کے تحت ۱۹۸۶ء سے اب تک ۳۳ مسلم طلبہ و طالبات فیض یاب ہو چکے ہیں، اور یہ سوسائٹی کے سابق صدر حکیم عبدالحمید مرحوم کے ایما پر اس لیے جاری کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں آگے لایا جائے اور ان میں مقابلے کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ ملک کی ترقی میں زیادہ موثر کردار ادا کر سکیں، خواہش مند طلبہ سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی - ۶۲ ... ۱۱ سے درخواست فارم منگا سکتے ہیں اور بھرے ہوئے فارم ۷ ستمبر ۲۰۰۰ء تک سوسائٹی کو واپس بھیج دیں۔

ملک میں آزادی کے بعد پہلی مردم شماری ۱۹۵۱ء میں ہوئی، اس کے بعد ہر دس سال کے وقفے سے مردم شماری ہوتی ہے، اب چھٹی مردم شماری ۲۰۰۱ء میں ہوگی، اس کے پہلے مرحلے کا کام ۱۱ مئی ۲۰۰۰ء سے ۱۰ جون تک ہوا جس میں گھروں کی فہرست اور ان کے افراد کے متعلق تفصیلات تیار کی گئیں، یعنی مکان، اس میں رہنے والوں کی تعداد، رہائش پذیر افراد کے سربراہ کا نام، عورت / مرد، درج فہرست ذات یا درج فہرست قبیلے وغیرہ ریکارڈ کیے گئے۔ دوسرے مرحلے کا کام ۹ فروری سے ۲۸ فروری ۲۰۰۱ء کو ہوگا، اس زیادہ اہم مرحلے میں مذہب، تعلیم اور زبان وغیرہ کے تعلق سے افراد کی تفصیل ریکارڈ کی جائے گی، ملک کی موجودہ آبادی اور اس کے بارے میں ان تفصیلات ہی سے ملک کی اقتصادی، تعلیمی اور سماجی ترقی کے منصوبے تیار کیے جائیں گے لیکن سہولت پسندی اور دوسرے اسباب سے مردم شماری کا کام کرنے والوں کے ریکارڈ میں ہزاروں لاکھوں مکانات چھوٹ جاتے ہیں اور مذہب اور زبان وغیرہ کے بارے میں غلط معلومات درج کر دی جاتی ہیں جن کا علم ناخواندہ لوگوں کو نہیں ہوتا، اس طرح کے حادثے کی زد میں اقلیتیں خصوصاً ان کے پسماندہ اور غریب طبقے زیادہ آتے ہیں، اس لیے پڑھے لکھے نوجوانوں کو صحیح اندراجات لکھوانے میں پوری مدد کرنی چاہیے، مسلمانوں کے مذہبی، سماجی اور سیاسی رہنماؤں کا بھی فرض ہے کہ وہ نہ ان کے نام اور گھر چھوٹنے دیں اور نہ مذہب اور زبان کے متعلق غلط اندراج ہونے دیں، اس سے غفلت یقیناً ایک قومی و مذہبی جرم ہے جس کا خمیازہ مدتوں بھگتنا پڑے گا۔

مقالات

ماہیت باری تعالیٰ پر ایک نظر

قدیم و جدید نظریات کی روشنی میں

از
جناب مولانا محمد شہاب الدین ندوی ٭

ذات باری تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات کے مسائل قرآن اور حدیث میں صاف و شفاف اسلوب میں مذکور ہیں جن میں کسی قسم کی تعقید یا پیچیدگی نہیں ہے مگر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے انہیں خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا گیا ہے اور یہ ساری کاوشیں کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا کے مصداق ہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین کے بعد دین میں ایسی ایسی بدعتیں اور خرافات ایجاد کی گئیں جن کی وجہ سے دین و شریعت کا حلیہ ہی بگڑ گیا اور رہی سہی کسر فلسفۂ یونان نے پوری کر دی۔ فلسفہ کی چاند ماریوں کی وجہ سے اسلام کا روشن چہرہ چھلنی ہو گیا اور اس کے صاف و شفاف عقیدے گرد آلود ہو گئے۔

اسلام اور یونان کی پیوند کاری چنانچہ قدیم متکلمین نے اسلامی عقائد میں ایسی ایسی موشگافیاں کیں کہ ان کے باعث دین کی حقیقت ہی مسخ ہو کر رہ گئی۔ منطق و فلسفے کے مقابلے کے لئے جو علم کلام ایجاد کیا گیا وہ خالص اسلامی نہ رہا بلکہ اس پر منطق و فلسفے کی ایسی چھاپ لگ گئی کہ وہ منقول و معقول کے درمیان ایک "جنس ثالث" بن کر رہ گیا۔

٭ جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ بنگلور - ۲۹۔

یعنی وہ نہ تو خالص شرعی رہا اور نہ خالص فلسفیانہ۔ چنانچہ فلسفے کی پیوند کاری کی وجہ سے اسلام کے بنیادی عقائد میں ایسی ترمیم کردی گئی کہ آگے چل کر یہ "ترمیم شدہ" عقائد اسلام کے متفقہ عقائد بن گئے۔ بالفاظ دیگر اسلامی عقائد کو متکلمین نے فلسفے کا لباس پہنا کر انہیں عربی کی بجائے یونانی بنا دیا۔ گویا کہ اللہ اور اس کے رسول سے کوئی "قصور" سرزد ہوگیا تھا۔ معاذ اللہ۔

اسلامی عقائد کی مغلوبیت | غرض متکلمین اسلام نے اسلامی عقائد کو مشرف بہ فلسفہ کر کے عقائد کی جو کتابیں لکھیں وہ پورے عالم اسلام میں رائج ہوچکی ہیں اور صدیوں سے انہیں کا بول بالا ہے۔ ان کے مقابلے میں اصل اسلامی عقائد دب کر رہ گئے ہیں، الا ماشاء اللہ۔ مثال کے طور پر اس سلسلے میں جو نئی بحثیں پیدا ہوئیں وہ اس طرح تھیں کہ اللہ تعالیٰ جوہر ہے یا نہیں؟ حیز میں ہے یا نہیں؟ اس کی صفات عین ذات ہیں یا غیر ذات؟ معاد جسمانی ہوگی یا روحانی وغیرہ۔

فلسفۂ یونان کی نظر میں اس عالم رنگ و بو کی چیزیں یا تو "بسیط" ہیں یا "مرکب"۔ بسیط سے مراد مفرد عناصر ہیں جو دور قدیم کے نظریات کے مطابق مٹی، پانی، ہوا اور آگ تھے اور یہ عناصر اربعہ کہلاتے تھے۔ چنانچہ یونانی فلسفے کی نظر میں دنیا کی تمام اشیاء انہیں چار عناصر سے بنی ہوئی ہیں اور مرکب سے مراد وہ اشیاء ہیں جو ان چار عناصر سے متشکل ہیں۔

زعم الحکماء ان العناصر الاربعۃ ھی الارکان التی ترکب منھا المرکبات۔[1]

مرکبات سے مراد معدنیات، نباتات اور حیوانات ہیں جن کو فلسفے کی اصطلاحات میں

"موالید ثلاثہ" کہا گیا ہے۔[2]

مضحکہ خیز تاویلات | اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ جب دنیا کی ہر چیز انہی عناصر سے مرکب ہے تو کیا ذات باری تعالیٰ کی ہستی بھی انہی عناصر سے مرکب ہے یا نہیں؟ تو اس موقع پر فلسفہ زدہ لوگوں کے سامنے ایک "مشکل" یہ پیش آئی چونکہ مرکب اشیاء یعنی مادی اجسام میں طبیعی اعتبار سے تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے، یعنی مرور ایام کی بدولت ان کی شکل و صورت چہرہ مہرہ، رنگ و روپ اور احوال و کوائف مسلسل بدلتے رہتے ہیں اور طبائع میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اس بنا پر وہ ایک حالت پر قائم نہیں رہتے۔ چنانچہ فلسفیانہ اصطلاح کے مطابق اس قسم کے تغیرات کی تعبیر اس طرح کی گئی ہے: الاجسام لا تخلو من الحوادث یعنی موالید ثلاثہ کے اجسام (طبیعی) حوادث سے خالی نہیں ہیں بلکہ ان کے اجسام میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔[3]

لہذا اگر ہم باری تعالیٰ کو انہی عناصر سے مرکب مان لیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے "جسمانی حالات" بھی بدلتے رہیں گے اور پھر ہمارے مشاہدے کی رو سے چونکہ یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ جو چیز متغیر ہوگی وہ حادث اور فانی ہوگی اور اس کا وجود دوامی نہیں رہ سکتا۔ لہذا انہوں نے اس "مشکل" کو حل کرنے اور یونانی فلسفے کا "جواب" دینے کی غرض سے ایک نیا عقیدہ ایجاد کیا جو نہ تو اسلامی ہے اور نہ یونانی۔ چنانچہ اس سلسلے میں قدیم فلسفہ زدہ اسلامی فرقہ (معتزلہ) نے اعلان کر دیا کہ: "اللہ تعالیٰ واحد اور سمیع و بصیر تو ہے (جو کسی بھی شے کی مانند نہیں ہے) مگر وہ جسم نہیں ہے، روح نہیں ہے، وہ جثہ نہیں ہے، وہ صورت نہیں ہے، وہ گوشت نہیں ہے، وہ خون نہیں ہے، وہ جوہر نہیں ہے، وہ عرض نہیں ہے، وہ طول نہیں ہے، وہ عمق نہیں ہے اور وہ کسی جہت میں

نہیں ہے"۔ وغیرہ وغیرہ۔

اسی بنا پر معتزلہ کے نزدیک باری تعالیٰ ایک "شے" ہونے کے باوجود آنکھوں کو نظر نہیں آسکتا۔ یہ معتزلہ کا نظریہ توحید کہلاتا ہے۔

اجمعت المعتزلۃ علی ان اللہ سبحانہ لایری بالابصار[۵]

حالانکہ یہ بات قرآن اور حدیث کی صراحتوں کے خلاف ہے۔ مگر معتزلہ کے نزدیک "عقل" "نقل" پر مقدم ہے۔ لہٰذا وہ "نصوص" میں تاویل کے قائل ہیں۔ بہرحال معتزلہ نے اپنے اس خود ساختہ عقیدے کو اتنی بلند آہنگی کے ساتھ پیش کیا کہ یہ عقیدہ آگے چل کر کلامی نقطہ نظر سے متکلمین اہل سنت والجماعت کا تقریباً متفقہ عقیدہ بن گیا۔

مگر اس کے ساتھ ہی متکلمین نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ باری تعالیٰ ان تمام "منفیات" کے باوجود قیامت کے دن دکھائی بھی دے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ "کچھ بھی" نہ ہونے کے باوجود "بہت کچھ" ہے۔ ایک طرف نفی ہے تو دوسری طرف اثبات۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑا عقلی تضاد ہے اور عقل انسانی دونوں دعووں کو بیک وقت تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور عقلی حیثیت سے اجتماع الضدین ایک امر محال ہے۔

اگر اسلامی عقائد میں اس "نفی" کے مقابلے میں "اثبات" کی طرف لے جانے والے دلائل موجود نہ ہوتے تو بہت ممکن تھا کہ خدائے ذوالجلال کے "لاشے" ہونے پر کبھی کا "اجماع" ہو چکا ہوتا۔ مگر اس کو اسلامی شریعت کا ایک معجزہ کہنا چاہیئے کہ اس میں ایسے نصوص یا واضح بیانات موجود ہیں جو اس قسم کا کوئی بھی انتہا پسندانہ اقدام کرنے سے ہر دور میں لوگوں کو روک سکتے ہیں۔ چنانچہ قرآن اور حدیث میں صاف صاف مذکور ہے کہ اہل ایمان قیامت کے موقع پر رویت باری سے مشرف ہوں گے۔ مثلاً:

وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۔
(قیامہ: ۲۲-۲۳)

بہت سے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے جو اپنے رب کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

توحید باری اور عقیدہ سلف

اسلامی عقائد نہایت درجہ سادہ اور فلسفہ و کلام کی آمیزش سے بالکل پاک ہیں جن کو ایک عامی اور عالم ہر ایک بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ واحد و یکتا ہے اور اس کی ذات والا صفات عظیم قوتوں سے متصف ہے۔ وہ سارے جہاں کا خالق، رازق اور کارساز ہے۔ وہ تمام موجودات عالم سے جداگانہ اوصاف کا حامل ہے۔ اس جیسی کوئی شے اس کائنات میں موجود نہیں ہے (لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَيۡءٌ) وہ عرش پر متمکن ہے، جیسا کہ اس نے اپنے کلام ابدی میں خبر دے رکھی ہے (اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى) مگر باری تعالیٰ اور عرش کی کیفیت نامعلوم ہے۔ وہ پوری کائنات کی تدبیر کر رہا ہے اور اس کی نظروں سے کوئی بھی چیز اوجھل نہیں ہے۔ وہ نہایت درجہ حکمت والا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔ اس جہان آب و خاک میں کوئی بھی اس کا ساجھی یا شریک یا ہمسر نہیں ہے اور وہ اپنی مخلوقات میں سے کسی بھی شے کے ہم مثل یا مشابہ نہیں ہے۔ وہ اشیائے عالم سے جدا اور یگانہ ہے۔ وہ کسی بھی چیز میں حلول نہیں کرتا اور نہ کوئی چیز اس کے اندر حلول کر سکتی ہے۔

غرض تمام سلف صالحین کا متفقہ عقیدہ یہی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں جس طرح اپنے کلام پاک میں خبر دے رکھی ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے، باقی اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ یہ معلوم کرنا یا اس کا کھوج لگانا انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور نہ رب العالمین نے اپنے بندوں کو اس کا مکلف بنایا ہے۔ لہٰذا ہمارے ایمان کی سلامتی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے محض ظن و تخمین کی بنا پر

کوئی ایسی بات اپنے منہ سے نہ نکالیں جو ذات باری تعالیٰ کی شان کے خلاف ہو۔ کیونکہ اس قسم کا کوئی بھی ظن وقیاس "قول بلا علم" کی قبیل سے ہوگا جس سے ہم کو منع کیا گیا ہے۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ (بنی اسرائیل: ۳۶)	تو اس چیز کے پیچھے مت پڑ جس کا تجھے علم نہیں ہے۔

اسی لئے امام مالکؒ سے جب پوچھا گیا کہ اِسْتَوٰی عَلَى الْعَرْشِ (اللہ کے عرش پر مستوی ہونے) کی کیفیت کیا ہے؟ تو اس کے جواب میں آپ نے ایک ایسا تاریخی جملہ فرمایا جو تمام سلف صالحین کے عقیدے کی نمائندگی کرتا ہے:

الاستواء معلوم وکنھہ مجہول والایمان بہ واجب والسوال عنہ بدعۃ۔	استواء (لغت کے اعتبار سے) معلوم ہے۔ اس کی حقیقت مجہول ہے۔ لیکن اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔

انسان کی نارسائیاں اسلامی عقائد کی اس "سادگی" پر ایک اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ علمی دور میں اس طرح کی بات ناکافی اور قلوب کے لئے غیر اطمینان بخش ہے اور اس سے موجودہ تجسس پسندانہ ذہن ومزاج کی تشفی نہیں ہوتی۔ بلکہ عصر جدید کا مزاج یہ ہے کہ وہ چیز کی "لم" یا علت دریافت کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ عقلی حیثیت سے ہر چیز کی وضاحت کا طالب ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان اصولی اعتبار سے خود اپنی ہی حقیقت سے لاعلم ہے کہ اس کی اصل کیا ہے؟ اس کی روح کیا ہے اور وہ کہاں سے آئی؟ بلکہ خود مادہ کیا ہے اور مادی ذرات (عناصر وجواہر) کی حقیقت کیا ہے؟ الکٹران اور پروٹان اور اس سلسلے کے دیگر

ذرات (ایلیمنٹری پارٹکلس) کس طرح وجود میں آئے اور وہ سب مل کر کس طرح باہمی تعامل کے ذریعہ عناصر وجواہر کی تشکیل کرتے ہیں؟ ان تمام مادی ذرات میں یکسانیت کیوں کر ہے؟ الکٹران میں منفی اور پروٹان میں مثبت برقی چارج کیوں ہے؟ اور پھر اس مثبت ومنفی برقی چارج کی حقیقت وماہیت کیا ہے؟ عناصر وجواہر سے اشیاء کس طرح وجود میں آتے ہیں؟ اور ان میں اختلاف رنگ وبو اور خصائص کی بوقلمونی کس طرح ظہور پذیر ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کے فلسفیانہ سوالات کا سائنسی نقطہ نظر سے کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ انسان ان اشیاء وخواص کی لم دریافت کرنے اور ان کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر ہے چنانچہ اس حقیقت کو عصر جدید کے تمام فلاسفہ اور سائنس داں تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کو صرف ظواہر اشیاء (فینامنن) ہی کا علم حاصل ہوسکتا ہے۔ اشیاء کے باطن (نومینن) کا علم کبھی اور کسی بھی حال میں نہیں ہوسکتا۔ مثال کے طور پر ایک جوہر (ایٹم) کے بارے میں انسان کو صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ دور قدیم کے نظریہ کے مطابق جس "جوہر فرد" کو ناقابل تقسیم قرار دیا جاتا تھا وہ اب الکٹران، پروٹان اور نیوٹران وغیرہ کی شکل میں تقسیم ہوچکا ہے۔ چنانچہ اب ایٹم کے ان اندرونی ذرات کے بارے میں انسان کا علم کافی وسیع ہوگیا ہے اور اس کی وسعت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ایٹم کے اندر پائے جانے والے "مرکزہ" (نیوکلیس) کا علم آج اپنی وسعت کے اعتبار سے (نیوکلیر فزکس) کے نام سے ایک مستقل علم بن گیا ہے اور اس علم کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ مختلف عناصر (ایلیمنٹس) کے مرکزوں کی "توڑ پھوڑ" (فزن) کے باعث ان کے اندر پوشیدہ دیوہیکل توانائی جسے جوہری قوت (ایٹمک انرجی) کہا جاتا ہے حاصل کرکے آج انسان ایک حیثیت سے تمدنی

فوائد حاصل کر رہا ہے تو دوسری طرف اسی توانائی سے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بھی بنا رہا ہے جو انتہائی ہلاکت خیز چیز ہے۔

علم آدم کے حدود

جوہر یا ایٹم سے یہ عملی استفادہ سکے کا صرف ایک رُخ ہے کہ انسان مادی اشیا کو صرف برت سکتا ہے اور ان کے اندر موجود توانائیوں سے استفادہ کر سکتا ہے مگر اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ وہ ان اشیا کی کارکردگی اور ان کی اندرونی علتوں کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔ یعنی ان اشیا میں موجود طبیعی خواص کس طرح کام کرتے ہیں اور کیمیائی اعتبار سے یہ تغیرات کس طرح وجود میں آتے ہیں؟ کیونکہ یہ بات "عالم شہادت" سے متعلق نہیں بلکہ "عالم غیب" سے مربوط ہے اور کوئی بھی انسان عالم غیب کی سرحد میں داخل نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا انسان کا علم محض چیزوں کے "ناموں" تک ہی محدود ہے اور ان کی اندرونی کیفیات سے وہ جاہل محض ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی صرف چیزوں کے نام ہی بتائے گئے تھے۔ ان کی باطنی کیفیات کا علم نہیں دیا گیا تھا۔

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا۔ (بقرہ: ۳۱)

اور اللہ نے آدم کو تمام (چیزوں کے) نام بتا دئے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے اب تک انسان صرف چیزوں کے "نام" ہی جانتا ہے اور اس نے سائنسی میدان میں ہمہ جہتی ترقی کے باوجود اس پر ایک تنکہ برابر بھی اضافہ نہیں کیا ہے۔

فتویٰ بلا علم

غرض انسان جب مادہ کی حقیقت نہیں جانتا، اشیا کی اصلیت سے ناواقف چیزوں میں موجود خواص کی علتوں سے ناآشنا اور خود اپنی کُنہ و حقیقت سے لاعلم ہے تو پھر اپنے خالق و مالک اور رب برتر کی حقیقت و ماہیت کا کیا خاک ادراک

کر سکتا ہے جو لامحدود اور حیرت انگیز قوتوں سے متصف اور تمام موجودات عالم سے یکسر مختلف و متباین ہے؟ لہٰذا ہمارے ایمان کی سلامتی کا تقاضا یہ ہے کہ اس نے اپنے کلام پاک میں اپنا تعارف جس طرح اور جس انداز میں کرایا ہے اور شارح قرآن حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اس کی شرح و تفسیر کی ہے اس پر صد فیصد ایمان لایا جائے اور اس کی کنہ و حقیقت دریافت کرنے کی بے سود کوشش نہ کی جائے، یا اپنے محدود اور ناقص علم کی رو سے قرآنی عقائد میں بے جا تاویل کر کے ان صاف ستھرے عقائد کا حلیہ بگاڑنے کی سعی نہ کی جائے جو ہمارے لئے خطرہ ایمان کا باعث ہوگا اور اس قسم کی کوئی بھی تاویل "فتویٰ بلا علم" کی قبیل سے ہوگی جو دین میں ایک مذموم حرکت ہے۔

بہرحال تمام سلف صالحین کا متفقہ عقیدہ یہ ہے کہ رب العالمین نے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا ہے اور جو کچھ بھی خبر دی ہے اس پر "بلا کیف" ایمان لایا جائے اور اس میں اپنی طرف سے خواہ مخواہ قسم کی حاشیہ آرائیاں نہ کی جائیں اور بلا وجہ شوشے نکال کر یا عقلی گھوڑے دوڑا کر صحیح اسلامی عقائد کا حلیہ بگاڑنے کی کوشش نہ کی جائے۔

قدیم فلسفہ از کار رفتہ

قدیم فلسفے اور کلام میں الٰہیات سے متعلق تمام مباحث حدوث عالم، اثبات صانع، جوہر، عرض، صورت اور ہیولیٰ کے گرد گھومتے ہیں اور ان تمام مباحث کا مرکز و محور باری تعالیٰ کی ذات و صفات ہے۔ مگر یہ تمام مباحث رویت و مشاہدہ اور تجربہ و استقراء سے عاری محض ادعائی ہیں جو محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں۔ چنانچہ یونانی الٰہیات میں اپنے مزعومات کے ثبوت میں کوئی مشاہداتی یا تجرباتی دلیل موجود نہیں ہے۔ اسی بنا پر جدید سائنسی حقائق کی رو سے یونانی نظریات از کار رفتہ یا آؤٹ آف ڈیٹ ہیں۔ چنانچہ حدوث عالم اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ کیونکہ جدید سائنس کی نظر میں اب یہ ایک مسلمہ

حقیقت ہے کہ یہ پوری کائنات ایک متعینہ وقت میں ایک دھماکے کے ذریعہ وجود میں آئی تھی جیسا کہ نظریہ عظیم دھماکہ (بگ بینگ تھیوری) سے واضح ہوتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے ہماری کائنات کی عمر تقریباً ۱۵ ارب سال بتائی جاتی ہے۔ اسی طرح جوہر اور عرض صورت اور ہیولیٰ کے تمام قدیم نظریات و تصورات اب ایک داستان پارینہ بن کر رہ گئے ہیں۔ کیونکہ پوری کائنات میں بنیادی طور پر ۹۲ قسم کے قدرتی عناصر پائے جاتے ہیں جو بجلی کے چند ذرات (الکٹران، پروٹان اور نیوٹران وغیرہ) سے مرکب ہیں اور ان میں صورت و ہیولیٰ کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خالی آنکھوں ہی سے نہیں بلکہ معمولی خوردبینوں سے بھی نظر نہیں آسکتے۔

اب جہاں تک جوہر یا ایٹم کا سوال ہے اگر ہم اسے "بسیط جسمانی" قرار دیں تو یہ نظریہ تقریباً درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم اسے "بسیط روحانی" قرار دیں تو جدید سائنس اور جدید فلسفے کی نظر میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ کیونکہ جوہر (ایٹم) کا اطلاق صرف "مادی شے" ہی پر ہو سکتا ہے۔ باقی روح اور عقل (جو قدیم فلسفے میں بسائط روحانی کہلاتے ہیں) کی حقیقت چاہے جو کچھ بھی ہو وہ "جوہر" نہیں ہو سکتے، جو ایٹم کے مترادف ہو۔ کیونکہ ایٹم صرف مادی ذرہ کا نام ہے، جس کی موجودہ دور میں ۹۲ قسمیں تجربے و مشاہدے کی رو سے استقرائی طور پر ثابت ہو چکی ہیں۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ روح ایک غیر مرئی اور غیر محسوس چیز ہے جس پر جوہر کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ صرف حکم الٰہی کے تحت غیر محسوس طور پر آئی ہے اگر وہ کوئی محسوس شے ہوئی تو سائنس اب تک اسے دریافت کر چکی ہوتی۔

متکلمین کی ایک جسارت رویت و مشاہدے کی بنا پر چونکہ ہماری دنیا کی مرکب چیزیں

حادث اور فانی ہوتی ہیں اس لئے فلاسفہ اور متکلمین نے اپنی دانست میں اللہ تعالیٰ کو "ٹوٹ پھوٹ" سے بچانے کی غرض سے یہ عقیدہ ایجاد کیا کہ وہ "مرکب" نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ "بسیط" ہے یعنی کوئی مفرد عنصر یا اس سے بھی ادنیٰ درجے کی چیز ہے معاذ اللہ۔ اس مہمل اور باطل نظریے کے نتائج و عواقب پر اب تک کسی نے غور ہی نہیں کیا جو شرک ہی کا ایک روپ ہے اور اس پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے۔

مگر اس سلسلے میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ اب بیسویں صدی میں "بسائط" یعنی مفرد عناصر بھی فانی ثابت ہو چکے ہیں۔ کیونکہ وہ ریڈیائی لہروں کے ذریعہ اپنی "جسمانیت" مسلسل کھوتے جارہے ہیں۔ چنانچہ آج اس کا نظارہ یورانیم (ایٹمی نمبر ۸۸) اور اس کے اوپر والے عناصر: اکٹینیم (ایٹمی نمبر ۸۹) تھوریم (ایٹمی نمبر ۹۰) پروٹیکٹیم (ایٹمی نمبر ۹۱) اور یورانیم (ایٹمی نمبر ۹۲) میں بخوبی ہو رہا ہے۔ ان عناصر کے مرکزوں سے تین قسم کی شعاعیں خارج ہوتی ہیں جن کو الفا شعاع، بیٹا شعاع اور گاما شعاع کہا جاتا ہے۔ اشعاع زنی کرنے والے ان عناصر کو "ریڈیو ایکٹیو عناصر" کہا جاتا ہے جو مسلسل اپنی جسامت کھوتے جارہے ہیں۔ مگر سائنس داں اب تک اس راز ربوبیت پر سے پردہ نہیں اٹھا سکے ہیں کہ ان عناصر میں یہ اشعاع زنی کیوں ہو رہی ہے؟

No one really Knows why some elements are radioactive-that is. why they under go nuclear decay. [5]

اس اعتبار سے آج یہ ایک حقیقت ثابت ہے کہ "مادہ" اپنی "مادیت" کھوتا جارہا ہے اور اس سلسلے میں نہیں معلوم کہ مستقبل میں مزید کیا کیا حقائق سامنے آنے والے ہیں۔ لہذا خداوند عالم کو بسیط کہنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اس سے ضمناً قدیم فلاسفہ کا ایک اور

نظریہ بھی مردود قرار پاتا ہے کہ ہماری کائنات کا مادہ "قدیم" یا لافانی ہے۔ بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مادہ خود بھی فنا ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ عناصر سے خارج ہونے والی یہ شعاعیں یا ریڈیائی لہریں بے کراں خلاؤں میں پہنچ کر غائب ہو رہی ہیں۔

نیز اس کے علاوہ سائنٹفک نقطہ نظر سے آج یہ حقیقت بھی ثابت ہو چکی ہے کہ "مادہ" کو مکمل طور پر "توانائی" میں اور توانائی (انرجی) کو مادہ (میٹر) میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی مفرد عناصر فانی ہیں جو بجلی کے چند ذرات کا مجموعہ ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک ماہر سائنس داں تحریر کرتا ہے کہ ہماری مرئی و محسوس کائنات نہ مادہ ہے اور نہ روح (یا توانائی) بلکہ وہ طاقت کی ایک غیر مرئی تنظیم ہے:

The visible world is neither matter nor spirit but invisible organization of energy.[۵۸] Matter can be changed into energy and energy into matter.[۵۹]

لہذا فلسفیانہ نقطہ نظر سے رب العالمین کو بسیط کہنا ایک لایعنی بلکہ مضحکہ خیز حرکت ہے جو چھوٹا منہ اور بڑی بات کی قبیل سے ہے۔

آخر جب خالق ارض و سما کو مرکب کہنا بھی مشکل اور بسیط کہنا بھی مشکل ہے۔ تو اس پیچیدہ اور مشکل ترین مسئلے کا حل کیا ہے؟ حل یہ ہے کہ ہم پروردگار عالم کو اپنے جہاں کے مادہ پر قیاس کرکے "بے جا" فتوے صادر کرنے کے بجائے یہ حقیقت تسلیم کر لیں کہ باری تعالیٰ ہماری کائنات کے "فانی مادے" سے مرکب ہونے کے بجائے کسی ایسے سوپر مادے سے آراستہ ہوگا جو "فنا" کی علت سے خالی ہو۔ ورنہ الٰہیاتی مسائل (ذات و صفات سے متعلق) حل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جدید ترین اکتشافات کی رو سے ہماری اپنی معلوم کائنات

میں کئی قسم کے مادے موجود ہیں جو اس مادے سے یکسر مختلف ہیں، جن سے ہمارے اجسام کی تشکیل ہوئی ہے اور جن کو خلاق عالم نے ہماری عبرت و بصیرت کے لئے پیدا کر رکھا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث اگلے صفحات میں آرہی ہے۔

غرض اس صورت میں "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (کوئی چیز اس کے ہم مثل نہیں ہے) کا مفہوم خود مادے پر بھی صادق آسکتا ہے۔ یعنی وہ ایسے مادے پر مشتمل ہو سکتا ہے جو ہمارے مادے جیسا نہیں ہے اور یہ بات عقلاً محال نہیں ہو سکتی۔ ورنہ رب العالمین "لاشے" بن کر رہ جائے گا۔ العیاذ باللہ۔

معتزلہ اور خلق قرآن کا فتنہ | معتزلہ کے نزدیک ذات باری تعالیٰ کے صفات کی نفی کا نام توحید اور تقدیر کے انکار کا نام عدل تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ تحریر کرتے ہیں: فالمعتزلة ومن اتبعهم من الشيعة يقولون: ان اصلهم المتضمن نفي الصفات والتكذيب بالقدر الذي يسمونه التوحيد والعدل.[۶۰]

معتزلہ (اور جہمیہ) کو ذات باری تعالیٰ کی صفات (جیسے علم، ارادہ، قدرت، کلام اور سمع و بصر وغیرہ) سے انکار اس بنا پر تھا کہ ان کے اقرار سے صانع عالم کی "جسمانیت" ثابت ہو جائے گی اور جب اس کی جسمانیت ثابت ہو جائے گی تو اس سے "حدوث عالم" کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کائنات کے "حادث" ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ "متغیر" ہے۔ (یعنی وہ ایک حال پر قائم نہیں ہے بلکہ اس کے احوال مسلسل بدل رہے ہیں) اور جو چیز متغیر ہو وہ فانی ہے۔ لہذا اس بنا پر اگر ہم اللہ تعالیٰ کو جسم مان لیں تو وہ بھی حادث اور فانی ہو جائے گا۔ اس لئے وہ جسم نہیں ہو سکتا۔

اس سے وہ ایک اور نتیجہ یہ نکالتے تھے کہ جب وہ جسم نہیں ہوسکتا تو وہ "متکلم" بھی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ تکلم کرنا "جسمانیت" کا خاصہ ہے۔ اسی بنا پر وہ قرآن کو کلام اللہ یا "قدیم" (ذات باری کی طرح) کہنے کے بجائے مخلوق یا "حادث" مانتے تھے یعنی جس طرح اور مخلوقات صادر ہوئی ہیں اسی طرح قرآن بھی ایک مخلوق کی طرح صادر ہوا ہے۔ اگر ہم قرآن کو مخلوق یا حادث نہ مانیں تو اللہ تعالیٰ کے لئے "تشبیہ" (لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ کے مطابق) اور "تجسیم" ثابت ہوجائے گی۔ یہ معتزلہ کی پوری فکر کا خلاصہ ہے۔ وغایۃ شبھتھم انھم یقولون: یلزم منہ التشبیہ والتجسیم [10]

ظاہر ہے کہ یہ معتزلہ اور ان کے متبعین کی ایک الٹی منطق تھی۔ کیونکہ صانع عالم یا خلاق ارض وسما کی جسمانیت کا اقرار کئے بغیر خود ظہور کائنات کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ظہور کائنات یا تخلیق ارض وسما کے لئے ایک فعال اور قدرت والی ہستی کی ضرورت ہے اور ایسی خلاق (یا فاعل) ہستی کا تصور بغیر جسم کے ممکن نہیں ہوسکتا۔ ورنہ پھر کائنات کو بھی "قدیم" ماننا پڑے گا یعنی بغیر کسی خالق کے موجود ہے۔ [11]

منکرین صفات (معتزلہ اور جہمیہ) کا موقف یہ تھا کہ اثبات صفات سے تجسیم باری لازم آتی ہے کیونکہ جو صفات سے موصوف ہوگا وہ لامحالہ جسم ہوگا (ھذا یستلزم التجسیم والتشبیہ۔ لانہ لا یعقل ما ھو کذلک الا الجسم) جب کہ اس کے برعکس صفات کا اثبات کرنے والوں کا موقف یہ تھا کہ بغیر جسم کے حیات، علم، قدرت، سمع، بصر، کلام اور ارادے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ (لا یعقل مالہ حیاۃ وعلم وقدرۃ وسمع و بصر وکلام وارادۃ الا ما ھو جسم) [12]

اسی بنا پر معتزلہ کا ایک اور فاسد اور نامعقول عقیدہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ

آنکھوں کو نظر نہیں آسکتا۔ حالانکہ آخرت میں رویت باری کے اثبات میں قرآن اور حدیث دونوں متفق ہیں۔ نیز انہیں قلوب کے ذریعہ بھی رویت باری کا انکار تھا۔ چنانچہ ان کا نظریہ یہ تھا کہ قلوب کے ذریعہ صرف اس کا علم ہوسکتا ہے۔ اجمعت المعتزلۃ علی ان اللہ سبحانہ لا یری بالابصار واختلفت ھل یری بالقلوب؟ فقال ابو الھذیل واکثر المعتزلۃ نری اللہ بقلوبنا بمعنی انا نعلمہ بقلوبنا۔ [13]

نفی صفات میں معتزلہ کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر ہم صفات باری کو قدیم مان لیں تو وہ بھی الوہیت میں شامل ہوجائیں گی یعنی اس کی جتنی بھی صفات ہیں ان سب کو الگ الگ خدا ماننا پڑے گا۔ لانہ لو شارکتہ الصفات فی القدم الذی ھو اخص الوصف لشارکتہ فی الالٰھیۃ [14]

اسی بنا پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کو قدیم نہ مانتے ہوئے اسے حادث اور مخلوق قرار دینے کی جرأت کی۔ واتفقوا علی ان کلامہ محدث مخلوق فی محل [15]

معتزلہ کے ایک فرقے کے نزدیک کلام اللہ جسم اور مخلوق ہے۔ (ان کلام اللہ جسم ومخلوق) اور ان کے ایک دوسرے فرقے کے نزدیک قرآن مخلوق اور "عرض" ہے۔ (ان القرآن مخلوق للہ وھو عرض) [16]

غرض معتزلہ قرآن اور حدیث کو آخری حجت ماننے کے بجائے عقل کو ان دونوں پر مقدم رکھتے تھے اور عقل یعنی معقولات جس کو قبول کر لیتے اس کا اقرار کرتے اور جس کو قبول نہ کرتے ان کا انکار کر دیتے تھے۔ فکل مسئلۃ من مسائلھم یعرضونھا علی العقل فما قبلہ اقروہ ومالم یقبلہ رفضوہ [17]

ایک خونچکاں داستان یہ تھا وہ پس منظر جس میں "خلق قرآن" یعنی قرآن کے مخلوق ہونے کا فتنہ ایک مہیب اور ہیبت ناک شکل میں تیسری صدی ہجری کے اوائل میں رونما ہوا جو

معتزلہ کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے حکومت وقت کی سرپرستی میں اپنے اس خود ساختہ عقیدے کو پوری امت پر لادنے کی غرض سے پہلے عباسی خلیفہ مامون کو اپنا ہمنوا بنایا اور پھر ۲۱۸ھ میں (جو مامون کی وفات کا سال بھی ہے) اس عقیدے کو بزور قوت جبری طور پر نافذ کرنے کا اعلان کر دیا اور علمائے وقت کو ایوان شاہی میں طلب کرکے انہیں اس عقیدے کو تسلیم کرنے پر مجبور کیا[1] اور جنھوں نے انکار کیا انہیں کوڑوں سے پٹوایا اور ایسی سخت سزائیں دیں جس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور یہ واقعہ تاریخ کا ایک سیاہ ترین باب بن چکا ہے۔ اگر اس سلسلے میں امت کے بطل جلیل امام احمد بن حنبلؒ نے بے مثال عزیمت و استقامت کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا تو صحیح اسلامی عقائد کا خاتمہ بالخیر کبھی کا ہو چکا ہوتا۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں اس بطل جلیل کا نام ہمیشہ کے لئے زندۂ جاوید بن گیا ہے جو خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی عظیم ترین استقامت کے بعد یہ دوسرا واقعہ ہے۔

معتزلہ اور متکلمین کی قلابازیاں یہ تھی معتزلہ کی فتنہ انگیزی جو فلسفہ یونان میں پوری طرح ڈوبے ہوئے تھے اور وہ اسلامی تعلیمات ہی کو نہیں بلکہ اس کے بنیادی عقائد تک کو فلسفے کی عینک سے دیکھتے تھے اور جو بات فلسفے یا عقل کے خلاف معلوم ہوتی اس کا بڑی ڈھٹائی کے ساتھ انکار کر دیتے تھے۔ غرض ایک طرف فلاسفہ اور متکلمین کی "تنزیہ ذات" تھی تو دوسری طرف صوفیہ کا عقیدہ "وحدت الوجود" تھا، یعنی "لا موجود الا اللہ" (کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں سب اللہ کا روپ ہیں) چنانچہ قرون وسطیٰ میں صدائیں اتنی بلند آہنگی کے ساتھ بلند ہوئیں کہ ان کے باعث ذات باری تعالیٰ اور اس کی توحید کی حقیقت ہی مشتبہ ہو گئی اور دین میں خرافاتی عقائد و نظریات کا دروازہ کھل گیا۔ جس کے جی میں جو آیا وہ کہنے لگ گیا اور جتنی باتیں منہ سے نکلیں اتنے ہی فرقے بن گئے۔ جیسا کہ اس سلسلے میں شہرستانی کی کتاب "الملل والنحل" شاہد ہے

اس موقع پر راقم سطور کو چونکہ جدید سائنسی نقطۂ نظر سے متکلمین اسلام کے اللہ تعالیٰ کو "بسیط" قرار دینے کی لغویت ظاہر کرنی ہے اس لئے اس موقع پر ذات باری تعالیٰ کے جسم ہونے یا نہ ہونے پر امت کے مختلف فرقوں میں جو نظریات پائے جاتے ہیں ان کا ایک مختصر جائزہ لیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس بحث سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ قرآن اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں جو کچھ مرقوم ہے اس پر "بلاکیف" یا بغیر کسی حاشیہ آرائی کے جوں کا توں ایمان لانا واجب ہے۔ ورنہ ہمارا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور جھگڑے فسادات سے چھٹکارا نہیں مل سکے گا اور یہ بات اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں نہایت درجہ ناقص ہے۔ کائنات کے بارے میں نئی نئی تحقیقات سامنے آ رہی ہیں اور قدیم نظریات از کار رفتہ ہوتے جا رہے ہیں۔ اس اعتبار سے معتزلہ اور متکلمین قدیم کے بہت سارے نظریات و مزعومات آوٹ آف ڈیٹ قرار پا چکے ہیں۔

ذات باری امت کی نظر میں اس بحث کا اصل نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب جسم ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں امت کے مختلف طبقات کے درمیان مختلف و متضاد نظریات پائے جاتے ہیں اور ان کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔ معتزلہ اور جہمیہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ صاحب جسم نہیں ہے، نہ وہ جوہر ہے اور نہ عرض۔ وہ کسی جہت میں بھی نہیں ہے۔ لیکن وہ اس کے باوجود "شے" تو ہے مگر وہ دیگر اشیاء کی طرح نہیں ہے۔ (اس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے)

۲۔ فرقہ کرامیہ اور مشبہہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ صاحب جسم ہے مگر وہ دیگر اجسام کی طرح نہیں ہے۔ (ھو جسم لا کالاجسام)[2]

۳۔ جہم اور بعض زیدیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو "شے" یا چیز نہیں کہا جا سکتا۔

کیونکہ شے وہ مخلوق ہے جس کا مثل ہوتا ہے۔ (ان الباری لا یقال لہ ان شئ لان الشئ
ھو المخلوق الذی لہ مثل)[۲۱]

۴۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اعتبار سے ہمارے جسموں ہی کی طرح ہے۔ چنانچہ وہ اپنے ائمہ کو خدا کے مانند اور خدا کو اپنے ائمہ کے مانند قرار دیتے ہیں۔ ثم الشیعۃ فی ھذہ الشریعۃ وقعوا فی غلو وتقصیر اما الغلو فتشبیہ بعض ائمتھم بالالہ تعالیٰ وتقدس واما التقصیر فتشبیہ الالہ بواحد من الخلق[۲۲]

۵۔ غالی شیعہ اور حشویہ کے نزدیک ان کا معبود صاحب اعضاء و ابعاض ہے جو یا تو روحانی ہیں یا جسمانی اور وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتا ہے نیچے اتر سکتا ہے اوپر چڑھ سکتا ہے اور ایک جگہ متمکن ہو سکتا ہے۔ قالوا: معبودھم علی صورۃ ذات اعضاء وابعاض اما روحانیۃ واما جسمانیۃ ویجوز علیہ الانتقال والنزول والصعود والاستقرار والتمکن[۲۳]

۶۔ تمام مسلمانوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایک شے ہے جو دیگر اشیاء کی طرح نہیں ہے۔
وقال المسلمون کلھم ان الباری شئ لا کالاشیاء[۲۴]

۷۔ معتزلہ کے نزدیک باری تعالیٰ اشیاء (مخلوقات) کے علاوہ ہے[۲۵]

غالی صوفیہ کے نزدیک اشیائے عالم یا مخلوقات ہی خدا کے روپ میں موجود ہیں یعنی اللہ تعالیٰ ان مادی اشیاء میں حلول کئے ہوئے ہے۔ بالفاظ دیگر دنیا کی تمام چیزیں "خدا پارے" ہیں اور اس عقیدے کو "عقیدہ حلول و اتحاد" یا نظریہ "وحدت الوجود" کہا جاتا ہے۔

۸۔ امام احمد بن حنبلؒ کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو نہ تو جسم کہیں گے اور نہ یہ کہیں گے کہ وہ جسم نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں ہی باتیں اسلام میں بدعت ہیں۔ لا اقول ھو جسم

ولا لیس بجسم لان کلا الامرین بدعۃ محدثۃ فی الاسلام[۲۶]

۹۔ امام ابو حنیفہؒ کے ایک قول کے مطابق اللہ تعالیٰ "ایک شئے" ہے مگر وہ دیگر اشیاء کی طرح نہیں ہے (وھو شئ لا کالاشیاء)[۲۷]

۱۰۔ بعض سلف نے اثبات صفات میں تشبیہ کی حد تک مبالغہ کیا ہے یعنی خدا کی صفات کو مخلوقات کی صفات کی طرح قرار دیا ہے (فبالغ بعض السلف فی اثبات الصفات الی حد التشبیہ بصفات المحدثات)[۲۸]

سلف صالحین کے مسلک پر ایک نظر

سلف صالحین یا اکابر متقدمین اس سلسلے میں دو فرقوں یا مسلکوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک فرقے نے صفات الٰہی میں تاویل کرتے ہوئے تشبیہ کی حد تک مبالغہ کیا ہے۔ جب کہ دوسرا فرقہ تاویل کا قائل نہیں ہے۔ جیسا کہ امام مالک وغیرہ ائمہ کا مسلک ہے۔

غرض سلف صالحین کی ایک کثیر جماعت اللہ کے لئے صفات ازلیہ کا اثبات کرتی ہے جیسے علم، قدرت، حیات، ارادہ، سمع و بصر، کلام، جلال، اکرام، جود، انعام، عزت اور عظمت وغیرہ اور وہ ذاتی اور فعلی صفات میں فرق نہیں کرتی۔ بلکہ وہ "خبری صفات" کا بھی اثبات کرتی ہے۔ جیسے اللہ کے دو ہاتھ ہیں اور اس کا چہرہ ہے اور وہ عرش پر مستوی ہے۔ جیسا کہ قرآن اور حدیث میں موجود ہے۔ لہذا ہم ان آیات کی تفسیر یا تاویل کرنے کے مکلف نہیں ہیں[۲۹]

مگر متاخرین کی ایک جماعت نے سلف کے مذکورہ بالا قول پر اضافہ کرتے ہوئے اتنا کہا ہے کہ ان نصوص کو ان کے ظاہری مفہوم پر محمول کرنا ضروری ہے۔ لہذا اس نے خالص تشبیہ کا پہلو اختیار کیا جو سلف کے اعتقاد کے خلاف ہے۔ ثم ان جماعۃ من المتاخرین زادوا علی ما قالہ السلف فقالوا لا بد من اجراءھا علی ظاھرھا فوقعوا فی التشبیہ

الصرف وذلک علی خلاف ما اعتقدہ السلف [30]

حاصل یہ کہ سلف کی اکثریت تشبیہ کی قائل تھی اور اس اعتبار سے وہ اللہ تعالیٰ کی جسمانیت کی بھی ایک حد تک قائل تھی۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہؒ کی صراحت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی جسمانیت تسلیم کئے بغیر صفات الٰہی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ لا یعقل مالہ حیاۃ و علم قدرۃ وسمع وبصر وکلام وارادۃ الاّ ما ھو جسم [31]

مگر اس سلسلے میں واضح رہے کہ کلام سلف میں اللہ تعالیٰ کے جسم ہونے یا نہ ہونے کی تصریح موجود نہیں ہے۔ مگر وہ اثبات کے برعکس نفی کی زیادہ مذمت کرتے ہیں۔ کیونکہ "تعطیل" یعنی اللہ تعالیٰ کو صفات سے معطل کرنا تشبیہ (اسے دیگر اشیاء کے مشابہ قرار دینے) سے زیادہ خطرناک ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں علامہ ابن تیمیہؒ تحریر کرتے ہیں: ان السلف والائمۃ کثر کلامھم فی ذم الجھمیۃ النفاۃ للصفات وذموا المشبھۃ ایضا وذلک فی کلامھم اقل بکثیر من ذم الجھمیۃ، لان مرض التعطیل اعظم من مرض التشبیہ واما ذکر التجسیم و ذم المجسمۃ فھذا لا یعرف فی کلام احد من السلف والائمۃ کما لا یعرف فی کلامھم ایضا القول بان اللہ جسم او لیس بجسم بل ذکروا فی کلامھم الذی انکروہ علی الجھمیۃ نفی الجسم کما ذکرہ احمد فی کتاب الرد علی الجھمیۃ [32]

سلف صالحین اور معتزلہ وجہمیہ کے درمیان تین بنیادی مسائل میں اختلاف تھا جو یہ ہیں: (۱) قرآن غیر مخلوق ہے (۲) اللہ تعالیٰ آخرت میں نظر آئے گا (۳) اللہ تعالیٰ عالم (سات آسمانوں) کے اوپر ہے۔ چنانچہ یہ تین مسائل وہ ہیں جن پر سلف امت، ائمہ کرام اور اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے۔ مگر معتزلہ اور جہمیہ کو ان تینوں باتوں سے انکار اس لئے تھا کہ ان کے اعتراف سے اللہ تعالیٰ کی جسمانیت ثابت ہو جائے گی۔ [33]

فلسفہ زدہ لوگوں کی ہرزہ سرائی

واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ یونان کے اثرات سے کلامیات اسلام صد درجہ متاثر ہو چکے ہیں۔ فلسفہ زدہ متکلمین نے یونانی نظریات کا مقابلہ کرنے کے بجائے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی عقائد اور خاص کر عقیدۂ توحید پوری طرح مشتبہ و مشکوک بن کر رہ گیا اور پھر متکلمین کی تحریروں میں بہت زیادہ تعارض و تضاد بھی دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک طرف فلسفے کی چاندماریوں سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کو جسم، جوہر، عرض اور جہت وغیرہ سے منزہ اور پاک قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف عقیدۂ سلف کے مطابق اسے مرئی اور قابل مشاہدہ بھی قرار دیتے ہیں جو ایک بڑا عقلی تضاد ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز نظر آنے والی ہو اسے لامحالہ طور پر جسم ہونا چاہئے۔ ورنہ اس لاینحل مسئلے کو دنیا کا کوئی بھی فلسفہ حل نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایک نظر آنے والی چیز کا وجود بغیر جسم کے ممکن نہیں ہو سکتا تو پھر اسے ایک معمولی جوہر یا ایک بہت بڑا جسم قرار دینے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ ہر جسم کو حادث قرار دینا ایک مہمل نظریہ ہے، جو سائنسی نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تحقیقات جدیدہ کے مطابق مادہ ایک پُراسرار شے ہے اور اس کی اصلیت کیا ہے؟ اس پر خود سائنس داں حیران ہیں اور دوسری بات یہ کہ جدید سائنس نے ہماری کائنات میں ایسے کئی قسم کے مادے دریافت کر لئے ہیں جو ہمارے معروف مادے سے مختلف ہیں (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے) لہذا ہو سکتا ہے کہ ہماری کائنات میں یا اس سے پرے ایسا کوئی مادہ یا سوپر مادہ موجود ہو جو فنا کی علت سے خالی ہو۔ اس سلسلے کے بعض اکتشافات نہایت درجہ حیران کن ہیں۔

لہذا ذات باری تعالیٰ کو ایک معمولی جوہر یا اس سے بھی کمترین درجے کی چیز تسلیم کر کے جو "لاشے" ہونے کے برابر ہے کیوں اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالا جائے؟ اور قرآن وحدیث کی

تصریحات کے مطابق یہ کیوں نہ کہا جائے کہ وہ اس قدر عظیم ہے کہ ساتوں آسمان اور زمین کی حیثیت اس کے مقابلے میں ایک رتی سی چیز کے مانند ہے؟ جیسا کہ قرآن اور حدیث میں صراحت موجود ہے کہ وہ قیامت کے موقع پر ساتوں آسمانوں کو ان میں موجود پوری مخلوقات سمیت اپنے ایک ہاتھ میں اٹھالے گا (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے) مگر متکلمین نے اس نقطہ نظر سے کوئی بحث ہی نہیں کی۔ بلکہ محض "حدوث اجسام" اور "تماثل اجسام" کے بے بنیاد نظریات کے سامنے سپرانداز ہوکر قرآن اور حدیث کے نصوص پر سیاہی پھیرتے ہوئے یہ ہانک لگادی کہ وہ معاذاللہ اس وسیع کائنات کے مقابلے میں ایک "رتی" سی چیز ہے۔ گویا کہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

لہذا اس موقع پر فلسفہ زدہ متکلمین کے نظریات پر تفصیلی بحث کرنے اور قول فیصل صادر کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جدید سائنسی نقطہ نظر سے ہماری کائنات میں موجود مادہ اور اس کی مختلف شکلوں پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ "تماثل اجسام" (یعنی تمام اشیاء ایک جیسی ہیں) کا فلسفیانہ نظریہ حد درجہ گمراہ کن ہے، جسے بنیاد بناکر "حدوث اجسام" کی عمارت کھڑی کی گئی نتیجہ یہ کہ خدائے عظیم کو "لاشے" قرار دے دیا گیا۔ حدوث اجسام کا نظریہ خدا کا وجود ثابت کرنے کی غرض سے اختیار کیا گیا تھا، مگر حیرت انگیز طور پر اس سے خدا کا وجود ثابت ہونے کے بجائے اشیائے عالم یا مظاہر کائنات کا وجود تو ثابت ہوگیا مگر خداوند قدوس کا وجود معدوم بن کر رہ گیا۔ تعالی اللہ عزوجل عن ھذہ الخرافات۔ الہیات کی یہ داستان اوہام بڑی ہی عبرتناک ہے۔

مادہ ایک راز ملکوتی

جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں اس قسم کے تمام مباحث اوہام وخرافات معلوم ہوتے ہیں، جو بلاوجہ فرض کرلئے گئے تھے۔ کیونکہ عصر جدید میں نہ صرف روح

بلکہ خود مادہ بھی ایک پُراسرار چیز بن کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی پہلی تحلیل میں بجلی کے چند ذرات کا مجموعہ ہے جو تین قسم کے ہیں: ایک منفی (الکٹران) دوسرا مثبت (پروٹان) اور تیسرا بے چارج (نیوٹران) اور ان ذرات کی حقیقت نامعلوم ہے اور وہ اپنی آخری تحلیل میں برقی لہروں یا نوری شعاعوں کا مجموعہ ہے۔ اب نہیں معلوم کہ ان لہروں یا شعاعوں سے عناصر وجواہر کس طرح وجود میں آئے؟ اس اعتبار سے "مادہ" ایک ایسا راز ملکوتی ہے جس کی حقیقت پر دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں اور پوری دنیائے سائنس اس کی نقاب کشائی سے عاجز وبے بس دکھائی دیتی ہے۔

مادہ اور ضد مادہ

اور پھر یہی نہیں کہ ہماری دنیا کا مادہ ایک سر نہاں یا ایک معمہ ہے بلکہ خود ہمارے مادہ سے مختلف خصوصیات رکھنے والا ایک "ضد" مادہ" بھی ہماری ہی کائنات میں موجود ہے، جسے "انٹی میٹر"[۳۴] کہا جاتا ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی کی تحقیقات کے مطابق اس ضد مادہ میں جو مرکزی ذرات موجود ہیں وہ عام مادے میں موجود ذرات (الکٹرانوں، پروٹانوں اور نیوٹرانوں) کی ضد اور مخالف برقی چارج رکھنے والے ہیں۔ یعنی ضد مادہ میں موجود الکٹران ہمارے معروف الکٹران کے برعکس مثبت برقی چارج رکھنے والا اور اسی طرح ضد مادہ کا پروٹان بجائے مثبت کے منفی چارج رکھنے والا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ عام مادہ اور ضد دونوں باہم مل کر نہیں رہ سکتے۔ بلکہ جیسے ہی وہ ایک دوسرے سے قریب ہوں گے، ایک سکنڈ سے بھی کم وقفے میں ایک دوسرے کو نیست ونابود کردیں گے اور اس کے نتیجے میں ایک بہت بڑی مقدار میں توانائی (انرجی) وجود میں آئے گی۔

چنانچہ سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ بعض بعید ترین کہکشائیں مکمل طور پر ضد مادہ پر مشتمل ہوسکتی ہیں۔ نیز اس کا بھی امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ ہماری معروف کائنات ہی کی طرح ایک ایسی "ضد کائنات" کا بھی وجود ہوسکتا ہے جو ضد کہکشاؤں، ضد ستاروں اور ضد

سیاروں پر مشتمل ہو۔

It has been suggested that some distant galaxies may be composed entirely of antimatter ....and the existanee of anti - universe consisting of antigalaxies. antistars, and antiplanets is possible.[25]

اس اعتبار سے گویا اب خود سائنس داں ہی ہماری اس معروف کائنات سے ماوراء ایک دوسری کائنات کے وجود کا اعتراف کرنے پر مجبور نظر آرہے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ اس قسم کی کتنی مزید پُراسرار کائناتیں موجود ہوں گی جو ہماری آنکھوں سے مستور ہیں۔

غیر مرئی مادہ اسی طرح اکتشافات جدیدہ کی رو سے ایک مزید حقیقت یہ بھی سامنے آئی ہے کہ ہماری کائنات کے مادے کا بہت بڑا حصہ "غیر مرئی" ہے، یعنی وہ جو نظر نہیں آتا۔ اسے "سیاہ مادہ" یا ڈارک میٹر[26] کہا جاتا ہے۔ چنانچہ سائنس دانوں کی تصریح کے مطابق اس کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔

Howeverthere is convincingevidencethat most of the matter in universe is not visible this unvisible matter is called dark matter.[27]

مادہ کی چوتھی شکل نیز اس کے علاوہ مادہ کی تین معروف شکلوں (ٹھوس، مائع اور گیس) کے علاوہ ایک چوتھی شکل بھی پائی جاتی ہے جسے "پلازما"[28] کہا جاتا ہے۔ اور یہ الکٹرانوں اور پروٹانوں کا ایک ڈھیر یا جوہروں (ایٹموں) کی "کھلی ہوئی" شکل ہے۔ یعنی ایک ایسا مادہ جس میں الکٹرانوں کو پروٹانوں سے الگ کر دیا گیا ہو۔ چنانچہ جب کسی ٹھوس مادہ (جیسے برف) کو چھ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ یا سیلسیس تک گرم کیا جائے تو وہ بالترتیب پہلے سیال، پھر گیس اور پھر پلازما کی شکل اختیار کرے گا اور یہ مادہ عناصر یا جواہر کا مجموعہ نہیں بلکہ "ٹوٹے ہوئے"

جواہر کا ایک "بے ترتیب" ڈھیر کہلاتا ہے اور اس عمل کو اصطلاح میں "رواں سازی" یا آیونائزیشن[29] کہا جاتا ہے جو ایک مصنوعی عمل ہے۔ مگر نظام عالم میں پلازما قدرتی طور پر بھی وسیع مقدار میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ستاروں میں پایا جانے والا اونچی تپش کا مواد بھی پلازما ہے[30] اور ان میں ہمارا سورج بھی شامل ہے۔ اسی طرح سیاروں کا بیرونی فضائی کرہ (ایٹموسفر) بھی پلازما پر مشتمل ہے[31] اور اندازہ لگایا گیا کہ ہماری کائنات میں پائے جانے والے جملہ مادے کا ۹۹ فیصد حصہ پلازما پر مشتمل ہے۔

It is estimated that over 99 percent of the matter in the universe exists in the plasma state Most of the bright stars-including the sun-are examples of the plasma state.[32]

(باقی)

مراجع

[1] کشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، محمد علی تھانوی (جدید ایڈیشن) ۲/۱۲۳۰، مکتبہ لبنان، ۱۹۹۶ء
[2] حوالہ مذکور: ۲/۱۶۶۸ [3] دیکھئے مذاہب الاسلامیین، ڈاکٹر عبد الرحمن بدوی: ۱/۳۹۸، دار العلم للملایین ۱۹۸۳ء [4] مقالات الاسلامیین، ابو الحسن اشعری: ۱/۲۳۵، المکتبۃ العصریہ بیروت، ۱۹۹۰ء [5] حوالہ مذکور: ۱/۲۳۸ [6] یہ قرآنی بیان ہی کی تصدیق و تائید ہے۔ دیکھئے سورۂ انبیاء آیت ۳۰ [7] Basic concepts of chemistry, P.435
[8] The Cosmic code, Hienz R.Pagels. P..
[9] World Book Encyclopedia Vol.-12 Penguin Books, 1984. -13 P.263.1995.
[10] موافقۃ صحیح المنقول لصریح المعقول، ۱/۱۲۶، دار الکتب العلمیہ بیروت طبع اول، ۱۹۸۵ء [11] شرح الطحاویہ فی العقیدۃ السلفیۃ، علامہ صدر الدین حنفی، تحقیق احمد شاکر، ص ۱۰۶، دار التراث قاہرہ [12] یہ دلیل علامہ ابن تیمیہؒ کی کتاب "موافقۃ صحیح المنقول" ۱/۱۱۰ سے ماخوذ ہے [13] موافقۃ صحیح المنقول: ۱/۱۰۹ [14] مقالات الاسلامیین، ابو الحسن اشعری: ۱/۲۳۸، المکتبۃ العصریۃ [15] الملل والنحل، شہرستانی ۱/۴۴، دار المعرفۃ بیروت، ۱۹۷۵ء [16] ایضاً: ۱/۴۵ [17] مقالات الاسلامیین: ۱/

۱۹ ۱۹۹۶ء دارالفکر العربی قاہرہ، ص ۱۲۹، ابوزہرہ: تاریخ المذہب الاسلامیۃ، ۲۰ ۲۶۸-۲۶۷
دیکھئے کتاب مذکور ۲۱ شرح الفقہ الاکبر، ابومنصور ماتریدی، ص ۷، دائرۃ المعارف، حیدرآباد۔
مقالات الاسلامیین، ابوالحسن اشعری، ۱/۲۵۹ ۲۲ الملل والنحل، شہرستانی، ۱/۹۳ ۲۳ ایضاً: ۱/۱۰۵
۲۴ مقالات الاسلامیین، ابوالحسن اشعری: ۱/۲۵۹ ۲۵ ایضاً ۲۶ موافقۃ صحیح المنقول، علامہ ابن
تیمیہ، ۱/۱۲۸ ۲۷ شرح الفقہ الاکبر، ملا علی قاری: ص ۵۵، دارالکتب العلمیۃ بیروت، ۱۹۸۴ء ۲۸
الملل والنحل، شہرستانی: ۱/۹۲ ۲۹ خلاصہ از الملل والنحل، شہرستانی: ۱/۹۲-۹۳ ۳۰ مرجع سابق:
۱/۹۳ ۳۱ موافقۃ صحیح المنقول: ۱/۱۰۹ ۳۲ مرجع سابق: ۱/۱۸۷ ۳۳ ایضاً ۳۴ ANTI -
Encyclopedia Britanica, Vol.11 P 703,1983. ۳۵ -MATTER
World Book Encyclopedia, Vol.13: ۳۶ DARK MATTER. ۳۷
۳۸ دیکھئے آکسفورڈ IONIZATION. ۳۹ PLASMA. ۴۰ .P.264.1995.
انسائیکلوپیڈیا، ۸/۱۲۳، ایڈیشن ۱۹۹۳ء ۴۱ دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا: ۱۴/۵۰۹، مطبوعہ
۱۹۸۲ء ۴۲ مرجع سابق (خورد) ۸/۲۹۔

کشمیر میں چک دور کے فارسی شعراء

از پروفیسر عبدالاحد رفیق*

کشمیر میں چک امراء نے بڑا عروج و رسوخ پایا۔ ۱۵۵۵ء میں اسماعیل شاہ اول کے بیٹے حبیب شاہ نے مسند شاہی پر قدم رکھا۔ محمد شاہ اور فتح شاہ کے باہمی بغض و عناد نے سلاطین کشمیر کی حکومت کو بالکل ہی بوسیدہ کر دیا تھا۔ سلطان فتح شاہ کی کم ہمتی نے سلطنت کشمیر کے حصے بخرے کرا کے امرائے کشمیر میں بانٹ دئے۔ جس سے سلاطین کی رہی سہی حکومت بھی جاتی رہی۔ حبیب شاہ کو تاج پہنے ابھی پورا ایک سال بھی نہیں گذرا تھا کہ غازی چک کے دل میں خود بادشاہ بننے کی ہوس سمائی۔ چونکہ چاروں طرف چکوں کا زور تھا۔ بادشاہ بالکل بے دست و پا تھا۔ اس لئے سلطان حبیب شاہ پر نالائقی کے الزامات عائد کئے گئے۔ علی چک نے جو غازی چک کا بھائی تھا یہاں تک جرأت کی کہ ایک دن بادشاہ کے سر سے سر دربار تاج شاہی اتار کر اپنے بھائی غازی چک کے سر پر رکھ دیا۔ چاروں طرف سے مبارک مبارک، سلامت سلامت کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ شادیانے بجنے لگے۔ سلطان حبیب شاہ جو سلاطین کشمیر کے پرحسرت و پرعبرت تماشے کا آخری دردناک ڈراپ سین تھا۔ تقدیر کی نیرنگیاں دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ تاج و تخت سے اتار کر نظر بند کر دیا گیا۔ اس بدقسمت اور برائے نام بادشاہ کے ساتھ اس سلوک کے لئے پہلے ہی منصوبے بنا لئے گئے تھے۔ کسی کو چکوں کے خلاف لب کشائی کرنے کی طاقت نہ تھی۔ جوان کی مرضی کے

* سٹیل فیکٹری روڈ۔ اپرصورہ۔ بڑہ پورہ ہری نگر۔ کشمیر۔

خلاف کرتا وہ لقمۂ اجل بن جاتا تھا۔[1]

چکوں کا دور حکومت فتنہ و فساد اور شورش کی آماجگاہ بنا رہا۔ جس طرح انہوں نے فتنہ پردازی سے سلاطین کی سلطنت کو تہ و بالا کر دیا تھا اسی طرح خود ان کے عہد حکومت میں بھی خانہ جنگیوں اور فتنہ انگیزیوں سے کشمیر پامال ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ باہمی جنگ و جدال اور جاہ پسندی کے نشے میں انہوں نے کشمیر کی خود مختار حکومت ضایع کر دی۔ ان کی عصبیت اور فرقہ وارانہ تنگ نظری سے مجبور ہو کر اہل کشمیر نے اکبر سے مداخلت کی خواہش کی۔[2] چنانچہ ۱۵۸۶ء میں اکبر کے سپہ سالار قاسم میر نے کشمیر کو کشت و خون کے بعد فتح کر لیا اور کشمیر کی شمع آزادی کو بجھا دیا۔[3]

چکوں کی باہمی خانہ جنگیوں کی وجہ سے تاریخ کشمیر کا رُخ بدل گیا۔ دراصل کشمیر کی عظیم سلطنت کے نظام کو چلانے کے لئے ایک مضبوط دل و دماغ کی ضرورت تھی۔ مگر سلاطین کشمیر کی حکومت کے زوال کے ساتھ ہی زمانہ بدلا اور تاریخ بھی بدل گئی۔ چکوں نے شاہمیریوں کے بنے ہوئے محلات اور باغات کو آگ لگا کر نیست و نابود کر دیا۔[4] اس کی وجہ سے سارے کشمیر میں سوگواری پھیل گئی۔

کشمیر کے اس انتشار، بے اطمینانی، بدحالی اور سیاسی کشمکش کی وجہ سے علم و ادب پر بھی زوال آیا اور شعراء کا وجود ہی معرض خطر میں پڑ گیا۔ کشمیر جہاں علوم و فنون برسوں سے پرورش پا رہے تھے اور ہر محلے اور ہر کوچے سے عالم، ادیب اور شاعر جنم لے رہے تھے۔ اب بدامنی کا شکار ہو گیا۔[5] کشمیر کے ایک عظیم مورخ جس نے تاریخ کشمیر جلد چہارم میں لکھا ہے:[6]

[1] مکمل تاریخ کشمیر از فوق محمد الدین فوق۔ واقعات کشمیر۔ تاریخ حسن [2] ایضاً [3] تاریخ کبیر از محی الدین مسکین۔ تاریخ کشمیر پر ایک نظر از پروفیسر حسن شاہ [4] مکمل تاریخ کشمیر ج ۲ [5] کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ از پروفیسر سرداری مرحوم [6] تاریخ حسن ج ۴ ص ۲۔

"بعد سلطان زین العابدین قریب یک صد سال بسبب فساد و عناد امرائے دریں محال ہرج و مرج بوقوع آمدہ ہیچ کسے پرداخت ایں علم نہ نمود۔ پس در عہد چکاں حسین شاہ چک کہ در سخن گستری طبع عالی داشت و پرورش و قدردانی سخنوران بسیاری کرد۔ حرفہ شعر و سخن اندک رواج یافت"۔[1]

بہرحال چک دور میں حسین خاں چک کے عہد حکومت میں ایک بار پھر کشمیر میں شعر و شاعری کا بازار گرم ہوا۔ شعراء دور دور مقامات سے کھنچ کھنچ کر آتے رہے۔ دوسرے چک سلاطین کے مقابلے میں وہ تعصب و تنگ نظری سے خالی تھا۔ اس کا وزیر ملک محمد ناجی تھا۔ جس کے مشورے سے اس نے حکومت بہترین انداز میں چلائی۔ اس بادشاہ نے محلہ خواجہ بازار میں ایک باغ بنوایا۔ "لچھم کول" نام کی ایک نہر نکلوائی جو اس باغ کے بیچوں بیچ سے بہتی تھی۔ حضرت خواجہ محمود نقش بندی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باغ میں ۱۰۳۳ھ میں خانقاہ فیض پناہ نقش بندیہ تعمیر کروائی۔ جو اب تک موجود ہے۔ چک دور کا یہ عظیم بادشاہ محلہ کمانگر پورہ میں آرام فرما ہے۔[2]

تمام مورخوں نے حسین شاہ چک کو عادل اور شجاع قرار دیا ہے۔ اگرچہ وہ بھی اپنے مسلک کا پیرو کار تھا مگر اس کے رگ و پے میں انصاف کا جذبہ کارفرما تھا۔ وہ کبھی انصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔ گو وہ بھی اپنے مسلک کی اشاعت کرتا تھا تاہم کسی کی دل آزاری اور مذہبی معاملات میں عصبیت اور جانب داری سے باز رہتا تھا۔ رعایا پروری اور انصاف پسندی اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی، وہ علماء و فضلاء کے علاوہ شعراء اور مشائخ کا بڑا قدرداں تھا۔[3]

حسین شاہ چک نے ہنرمندوں اور ماہرین فن سخنوروں اور دانش مندوں کی پوری قدر افزائی کی۔ ان کے وظائف اور مشاہرے مقرر کئے۔ قدرت نے اس کو طبع موزوں عطا کی تھی اور خود بھی

[1] مختصر تاریخ کشمیر از سیف الدین پنڈت مترجم محمد امین پنڈت [2] مکمل تاریخ کشمیر ج ۲۔ از محی الدین فوق، ص ۱۳۰۔

شعر کہا کرتا تھا[1]

حمایل کردہ تیغ و بستہ خنجر یار می آید — دلا برخیز و کاری کن جان در کار می آید

دیگر

آن ترک آن پوش سوار سمند شاہ — یاران قدر کنید کہ آتش بلند کند[2]

آخری ایام میں سلطنت چھوڑ دی اور خود موضع زینہ پورہ میں مکین ہوا۔ جہاں سے باغات دار السرور سے کچھ کم نہ تھے ۹۷۷ھ میں وفات پائی۔

اس دور کے معروف و مشہور شعراء میں **میر علی** شمار ہوتے ہیں۔ جو ایران کے نامور علماء اور فضلاء میں شامل تھے۔ حسین شاہ چک کے عہد حکومت میں کشمیر آئے اور شمع سخنوری روشن کی۔ اشعار برجستہ کہا کرتے تھے۔ کشمیر کی تعریف میں ایک نظم لکھی۔ خط نستعلیق میں بے نظیر اور لاثانی تھے۔ شعر کہا کرتے تھے۔ موتی بکھیرتے تھے۔ محلہ بٹہ کدل میں باغ میں باغ علی مردان خاں کے قریب ایک حویلی میں رہا کرتے تھے۔ وہاں پر ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔ مسجد ابھی تک موجود ہے اور وہ اسی مسجد کے صحن میں دفن ہیں۔ یہ اشعار یادگار ہیں

سبو سبو دہ خم خم دل موند مرا — قدح چہ آب زند آتش بلند را

گل بدستم چہ نہی در کف من خار خوش ست — این گل تازہ بر آن گوشہ دستار خوش ست

اس دور کا ایک اور اہم فارسی شاعر **ملا نامی اول** گذرا ہے جو کہ حسین شاہ چک کا مصاحب اور مداح بھی تھا۔ صرف و نحو کے ساتھ بڑا شغف تھا۔ اگرچہ وہ کبڑا ہو گیا تھا مگر پھر بھی بزم آرائی میں بڑا شوق رکھتا تھا۔ محافل و مجالس میں بزم آرائی میں کمال حاصل تھا۔ یہ چند اشعار اب باقی رہے ہیں

عروسی است می شادی آئین او — کز نتوان روان داد کابین او

---

[1] تذکرہ شعرائے کشمیر از راشدی ۳ ص تاریخ حسن ج ۴ ص [2] مکمل تاریخ کشمیر از فوق ج ۲

بخاموشی چہرہ زبانے دہد — بفر قوت زور جوانے دہد

چو پیدا است چوں نمود تن را گہر — مے آتش کہ پیدا کند شان ہنر

ہرگز دلم بغیر تو مائل نمی شود — وز دیدہ نقش روئے تو زائل نمی شود

از دوریت چہ باک کہ از بعد ظاہری — اصلاً میان ما و تو حائل نمی شود

دستم بریدہ باد چہ کار آیدم بگور — در گردن بتاں چو حمایل نمی شود

اس دور کا ایک اور شاعر **ملا نامی ثانی** بھی حسین شاہ چک کے دربار کے شعراء کے ساتھ منسلک تھا اور حسین شاہ چک کے ساتھ اس کو کافی لگاؤ رہا ہے۔ اکثر وہ حسین شاہ کے ساتھ دل لگی اور مذاق بھی کرتا تھا۔ ایک بار عید کے موقع پر بادشاہ سے خلعت اور گھوڑا طلب کیا اور کہا خلعت شاہی مرا اسپے رسد بازیں رسد۔

حسین شاہ چک نے جواب میں کہا۔ ایں چنیں کم فہم را نے آں رسد نے ایں رسد

بابا طالب اصفہانی چک دور میں ایک اہم شاعر گذرا ہے۔ وہ کشمیر آیا اور یہاں کے حکام کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر کے چکوں کے امراء کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ اس نے کشمیر کے امیروں کے درمیان صلح و صفائی کرائی۔ اکبر شاہ کے کشمیر فتح کرنے کے وقت تک زندہ تھا۔ شعر و شاعری کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی۔ محلہ بابا پورہ میں مزار بابا خلیل میں دفن کیا گیا۔ اشعار سے اس کی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔

از سر کوئے تو دل ما دیدہ تر می رود — شعلہ در دل نالہ بر لب خاک بر سر می رود

بے روئے تو از دیدہ بیرون کم نظر را — گر ذوق تماشائے تو منظور نباشد

ویرانہ دل ما چوں سر تعمیر ندارد — بگذار کہ ایں میکدہ معمور نباشد

اس دور کے ایک اور فارسی شاعر کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔ یہ **ملا مہدی** ہیں۔ جو

علی شاہ چک کے دربار کے ساتھ وابستہ تھے۔ علمی فضیلت کے ساتھ شعر و شاعری میں بڑا کمال حاصل تھا۔ یہ شعر حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی تعریف میں ہے۔

مرتضیٰ پادشہ کشور عالی نسبی است   آفتاب است کہ برج شرفش دوش نبی است

مغلوں اور کشمیریوں کی لڑائی کے دوران میں کشمیر میں قحط کی حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے

؎ گر نظر بر ہلال می کردند   لب نانے خیال مے کردند

گردن خرد دربازی کردند   دہن آز باز می کردند

محمد امین مستغنیؔ اس دور کے ایک اور اہم شاعر گذرے ہیں اور یوسف شاہ چک کے دربار کے شاعر تھے۔ یوسف چک کی ہر محفل میں حاضر رہتے تھے۔ جب یوسف شاہ ہندوستان سے کشمیر واپس آیا اور حافظ شیرازی کے دیوان سے فال لیا تو یہ شعر نکلا۔

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعان غم مخور   کلبۂ احزان شود روزے گلستان غم مخور

بسوزش عرق منت آتشے نبود   تحملے کہ کرم را کنیم داغ کجا است

سیاہی شب ما را سیر و یہ تو مہر   رخے کہ در رہ ما می نہد چراغ کجا است

دریں چمن ہمہ بیگانہ ہم اندولے   ز بلبلم سخن آشنا بگوش آمد

من خندہ نیم بطبع عاشق ناساز   یا گریہ گہ روئے دوم چوں غماز

یا نالہ کہ سر بگوش بیگانہ نہم   من درد دلم خلوتی محرم راز

ای سینہ ز وسواس توام نارستان   رگہائے وجودم نہ تو زنارستان

عیسی کدہ از چشم تو بیمارستان   ناز تو بکائنات در کارستان

رباعی دو شمۂ بچشم دل نہاں از مردم   دیدم نہ بہشت بلکہ کشمیر دوم

خاکے ز عبیر و مشک آگندہ خمیر   آب ز صفا وجود خود یافتہ گم

محلہ آروٹ متصل فتح کدل مقبرہ سید جمال الدین کے باہر احاطے میں دفن کئے گئے۔

اس دور کے ایک اور فارسی شاعر **مرزا علی خاں** مجرم بیگ کے والد تھے۔ یہ بے نظیر صاحب طرز اہل قلم اور اچھے مقرر تھے۔ سنہ ۹۹۰ھ میں یعقوب خاں اور بھگوان داس کی لڑائی میں مارے گئے۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے۔

شام چو از چہرہ فگندی نقاب   تاب نیاورد دنشت آفتاب

علی ملک چک بھی اس دور کے فارسی شاعر تھے۔ وہ فوج میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

؎ ترا نہ تکمہ سرخ است بر قبائے حریر   کہ کشتہ قطرہ خون منت گریبان گر

محمد ملک چوڑوری بھی ایک فوجی افسر ہونے کے علاوہ شعر و شاعری کرتے تھے اور رزمی ان کا تخلص تھا۔ علی ملک چک اور محمد ملک اس لڑائی میں مارے گئے جو ۹۸۸ھ میں یوسف چک اور سید مبارک کے درمیان عیدگاہ سری نگر میں واقع ہوئی تھی اور جس میں سید مبارک نے کامرانی حاصل کی تھی۔ ملک محمد کا شعر ملاحظہ ہو:۔

تیر مژگاں تو از جوشن جان می گذرد   آری ایں تیر بزور در گمان می گذرد[1]

یوسف شاہ چک اپنے عہد حکومت میں ایک اچھے اور زود گو شاعر تھے فن موسیقی کے استاد تھے۔ ان کے کلام میں سے یہ چند اشعار خوب ہیں؛

برباد دو زلف بت کشمیر نژادے   شدہ نادر سر و ما سر از گریہ دو چشم[2]

لیلا جمازہ را بر مجنون بخود تراند   زور کمند جذبۂ معجز نمائے اوست

دل پر ز درد من جانان لسان غنچہ پرخون است   بجوبے رحمی نہ پرسیدی کہ احوال دلت چوں است

---

[1] تاریخ ملک حیدر صفحہ ۱۶۲ [2] ایضاً

بعیش کوش کہ تا چشم مے زنی برہم   خزان ہمے رسد و نو بہار می گزرد

یوسف شاہ نے ابدال بٹ کو جواب میں ایک منظوم چٹھی لکھی تھی۔ اس کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں[1]:

چہ می گوئی اے گرگ ابدال رنگ   بر سانی از آب دہن نہنگ

غضنفر بعد فربہ آور دسر   حذر کن ز روباہ باز می گذر

تو بودی کشاورز آبائے من   کشاورز را کے سزد جائے من

بشمشیر و خنجر ترا نیست کار   کشاورز را یا دلیری چہ کار

پے حرب من لشکر آراستی   شبخون کنان سوئے من خاستی

من آنگہ عنان باز پیچم براہ   کہ یا سر دہم یا ستانم کلاہ

اس دور کے ایک عظیم فارسی شاعر اور مذہبی بزرگ جناب **شیخ یعقوب صرفی** کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ۹۲۸ھ میں تولد ہوئے۔ یہ کشمیر کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم ظاہری کے بعد سمرقند جا کر شیخ حسین خوارزمی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مرید ہوئے، مرشد خاص توجہ اور مہربانی سے پیش آئے۔ واپس کشمیر آئے تو خلقت کے ٹھٹ کے ٹھٹ فیض حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ انہوں نے کچھ عرصے کے بعد خراسان کے راستے حجاز کا سفر کیا اور شیخ ابن حجر سے حدیث پڑھی اور سند حاصل کی۔ متعدد سفر کئے اور کئی اولیاء اللہ سے ملاقات کی۔ واپس کشمیر پہونچے تو یہاں شیعہ سُنی جھگڑا زوروں پر تھا۔ جب یعقوب چک نے قاضی موسیٰ کو شیعہ مسلک کے طریقے پر خطبہ نہ پڑھنے پر شہید کرا دیا اور اہل سنت کے لئے حالات بہت ناسازگار ہو گئے تو شیخ

---

[1] مکمل تاریخ کشمیر

یعقوب صرفی بابا داؤد خاکی کو ساتھ لے کر اکبر کے پاس لاہور پہنچے اور کشمیری عوام کی طرف سے دعوت دی۔ اکبر پہلے ہی سے اس موقع کی تلاش میں تھا۔ اس نے اپنی فوجیں کشمیر بھیجیں اور اکتوبر ۱۵۸۶ء میں کشمیر مملکت مغلیہ کا حصہ بن گیا[1]۔

اس واقعہ کے بعد اکبر اور شیخ کے درمیان ضرور خاص روابط پیدا ہوئے ہوں گے لیکن ملا عبدالقادر بدایونی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روابط پہلے ہی سے چلے آرہے تھے۔ بلکہ ان کا بیان یہ بھی ہے کہ ہمایوں کو بھی شیخ یعقوب صرفی رحمۃ اللہ علیہ سے اعتقاد تھا[2]۔

وہم پادشاہ مغفرت پناہ ہمایوں او ہم شاہنشاہی اکبر را نسبت وے اعتقاد غریب بود۔ بشرف صحبت اختصاص داشتہ منظور نظر شفقت اثر گشتہ معزز و مکرم و محترم بود[3]۔

شیخ یعقوب صرفی کشمیریؒ جامع صفات تھے۔ وہ عالم اور شیخ وقت ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ خمسہ کا جواب بھی لکھا۔ پاکستان میں فارسی ادب میں ان کا تذکرہ ساٹھ صفحوں پر محیط ہے۔ بدایونی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے فیضی سے بڑے مراسم تھے اس کی علمی اور ادبی صحبتوں میں وہ اکثر شریک ہوتے۔ اس کی تفسیر سواطع الالہام کی تکمیل کی تاریخ بھی کہی تھی۔ فیضی اور ابوالفضل سے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے بھی تعلقات تھے۔ ان کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ انہوں نے فیضی کی تفسیر کی تکمیل میں مدد بھی کی تھی۔ ایک مقالے میں نوجوان فرزند میر محمد یوسف کو خطاب کرتے ہوئے نصیحت کرتے ہیں:

---

[1] رود کوثر ۲۲۵ [2] تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ شیخ یعقوب اثنائے سفر میں شاہ طہماسپ کے ایام حکومت میں ایران پہنچے تھے۔ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب ہمایوں بھی وہاں مقیم تھا، ممکن ہے ان ایام میں ہمایوں سے روابط قائم ہوئے ہوں (رود کوثر) [3] منتخب التواریخ از بدایونی۔

ہ الا ای دیدہ دل نور دیدہ   مسرت بخش جان غم رسیدہ
گل باغ صیانم قرۃ العین   عروس ہستم را زینت وزین
محمد یوسفت نامت خوانم   کہ باشد صورت و معنی است ہم
اگر داری سوای علم در سر   عمل باید وگرنہ جہل بہتر
نخواہم کسب علمت بہر دنیا   کہ تا باشد بصدر مجلست ما
شوی قاضی و مفتی و مدرس   بہر حالت بدل شیطان مونس
براہ حق بس است از علم خوانی   کہ فرض و سنت و واجب بدانی

وہ اپنے والد ماجد سے شعر و سخن میں اصلاح لیتے تھے، فرماتے ہیں :

چو در سال ہفتم نہادم قدم   ز طبعم رواں گشت شعر عجم
پدر کردی اصلاح اشعار من   باصلاح بودی مددگار من

شیخ یعقوب صرفیؒ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ خندہ بون میں حاصل کی۔ اس مدرسے کے پرنسپل ملا اخوند بصیر تھے۔ اس کے علاوہ ملا آنی بھی یہاں درس و تدریس کے کام میں مشغول تھے۔ یہ مدرسہ اپنے دور میں علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

بقول مفتی محمد سعادت کشمیر کے بڑے بڑے عالم اور فاضل یہاں زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ مگر ان ہی دنوں ملا بصیر کی نسبت کہا گیا کہ وہ امامیہ اثنائے عشری مسلک کو وقعت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ شیعہ ہم سخنے دارد۔ مگر خواجہ محمد اعظم دیدہ مری فرماتے ہیں کہ دامنش از آلایش قیاسات مردم مبرا بودم۔ بہر حال مولانا صرفی رحمۃ اللہ علیہ نے خندہ بون کے مدرسہ کی بجائے قطب الدین پورہ کی شاہی

درسگاہ میں تعلیم حاصل کی۔ یہاں ان کے استاد میر رضی الدین تھے۔ جن کی وفات ۹۵۶ھ میں ہوئی۔ صرفیؒ نے تاریخ وفات لکھی ہے۔

میر در سجدہ جان سپرد بحق

کشمیر کے ایک مشہور عالم اور استاد مولانا محمد آنی نے جب ان کی یہ غزل سنی تو مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ لڑکا اپنی علمی قابلیت کا سکہ تمام دنیا میں قائم کرے گا۔

اے رخ مہ طلعتاں آئینہ روی توام   میلی خوبان در ہوائی روئی نیکوئی توام
گر ببویم غیرے را دگر مشک ختن   در دماغ بال نمی آید بجز بوئے توام
گرچہ من سازد پری دیوانہ مردم را ولی   گویدت دیوانہ زنجیر گیسوی توام

شیخ کی تصانیف کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ ان کو فارسی زبان اور ادبیات پر پورا عبور حاصل تھا۔ کلام میں روانی اور شگفتہ بیانی ہر جگہ نمایاں ہے۔ رباعیات میں صوفیانہ رنگ غالب ہے۔ جن میں صوفیانہ رموز اور خالص توحید کے نکات ملتے ہیں۔

چوں مشرف شد ز فیض باطنی   شدہ زاں شاہ ولدیت انتہا
پس ز فیض باطنی تاریخ آن   کن طلب واللہ اعلم بالصواب

دیوان صرفی جدت مضامین، طرز ادا اور اسلوب بیان کے اعتبار سے بہت ہی اعلیٰ و ارفع ہے۔ غزلیات میں حق جوئی، حقیقت شناسی، وجد، جوش، عشق و محبت، درد، سوز و گداز، بے خودی۔ خالص توحید، فنا اور بقا کے جذبات بیان کئے گئے ہیں۔ زلفِ خال چشم سرمہ۔ شراب۔ پیر مغاں۔ گل و بلبل کی تراکیب عام ہیں۔

ہ ای مقامی است کہ نہ صبح و شام است اینجا   روز و شب روشنی از پرتو جام است اینجا
میکشاں طی مقامات بمی حنا نہ کنند   سفری نیست کہ نے باد کام است اینجا

مستی مے کند از ہستی خود آزاد ہر کہ آزاد ز خود گشتہ غلام است اینجا

کفر و دیں را نہ رسد دست بطاق در بر چہ حد میکدہ و کعبہ کدام است اینجا

عشق برتر بود از پختگی و خامی عقل خام چوں پختہ شود چو خام است اینجا

صرفی کا دیوان میر حبیب اللہ کاملی کی سعی و کوشش سے شایع ہوا ہے۔ ۱۲ ماہ ذی قعدہ ۱۰۰۳ھ کو انتقال فرمایا اور محلہ ایشاں صاحب زینہ کدل میں آرام فرما ہیں۔ روضہ زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

اس دور کے ایک اور فارسی کا شاعر حضرت بابا **داؤد خاکی** رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ کشمیر میں ان کا خاندان علم و ادب اور روحانی کمالات میں مشہور رہا ہے۔ تصانیف کے نام یہ ہیں: ورد المریدین۔ شرح ورد المریدین۔ دستور السالکین۔ قصیدہ جلالیہ۔ رسالہ غسلیہ۔ بابا صاحب کو صوفیہ کی صحبت بہت عزیز تھی۔ ۹۹۲ھ میں وفات پائی

نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیے:

گہ بہ مسجد روم و گاہ میخانہ شوم من بیچارہ ترا طلبم ہر سو بہم

نتوانم کہ شمارم کرم و نعمت تو گر زبانم شود اندر تن من از ہر مو

خاکیا بیرشدی از طلب یار ہنوز از گلستان وصالش نہ شنیدی بود

یہ شعر قصیدہ لامیہ سے ہے۔

مرتضیٰ را دیدم و پرسیدم از ولی حال رفض گفت بیشک ہست درسب سلمانان وبال

کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفی ہونے کے باوجود ان کو شعر و شاعری کے ساتھ خاص لگاؤ اور ہر صنف سخن پر قدرت حاصل تھی۔ مگر قصائد سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کے قصائد بڑے زور دار اور پُرشکوہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطری طور پر

شاعر تھے لیکن ان کی طبیعت مشکل پسند تھی اور غربیت کا دور تھا۔ قصائد میں صنائع و بدائع کی بہتات ہے۔ تاہم غزلوں کا انداز سلیس آسان اور دل نشیں ہے۔

مآخذ

۱۔ کشمیر جلد دویم، پاکستان: از جی۔ ایم۔ ڈی صوفی، ۲۔ مکمل تاریخ کشمیر از فوق۔ ۳۔ تاریخ ملک حیدر، شعبۂ تحقیقات کشمیر یونیورسٹی ۴۔ شیعیان کشمیر، از غلام صفدر۔ ۵۔ تاریخ واقعات کشمیر از خواجہ محمد اعظم دیدہ مری ۶۔ کشمیر انڈر سلطانز از محب الحسن ۷۔ مختصر تاریخ کشمیر از محمد امین پنڈت ۸۔ تاریخ حسن، جلد دوئم و چہارم ۹۔ تاریخ کبیر از محی الدین مسکین سرائے بلی ۱۰۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ ۱۱۔ تذکرہ راشدی ۱۲۔ تاریخ کشمیر پر ایک نظر از حسن شاہ ۱۳۔ حیات صرفی از سعادت ۱۴۔ رود کوثر، از شیخ اکرام ۱۵۔ پاکستان میں فارسی ادب، جلد اول ۱۶۔ منتخب التواریخ از بدایونی ۱۷۔ نگارستان کشمیر۔

کشمیر سلاطین کے عہد میں

ترجمہ: علی حماد عباسی، ایم اے

یہ کتاب پروفیسر محب الحسن کی انگریزی تاریخ "کشمیر انڈر سلطانز" کا اردو ترجمہ ہے اس میں کشمیر کا جغرافیہ، رقبہ اور حدود، سلاطین کشمیر کی حکومت کی تاسیس، عربوں کے حملے، خاندانی جھگڑے اور بغاوتیں، ثقافتی سرگرمیوں یعنی تعلیم، صنعت و حرفت، مصوری، سنگ تراشی، فن تعمیر، موسیقی وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اور مغل فرماں رواؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت رہی، اس کی نہایت مستند اور مفصل تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔

قیمت: ۷۵ روپے۔

اخبار الاخیار کے ادبی لسانی اور تاریخی محاسن

از جناب اصباح خاں صاحب*

عہد اکبری میں شعائر اسلام کی بے حرمتی و تضحیک اپنے عروج پر تھی اور دربار میں کھلے عام اہل حق پر طعن و تشنیع اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر اعتراضات کئے جارہے تھے۔ اسی زمانے میں ۹۹۹ھ/ ۱۵۹۰ء میں حضرت شیخ عبدالحق حج بیت اللہ سے واپس تشریف لائے تھے۔ وہ اس صورت حال کو برداشت نہیں کرسکے، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے "مدارج النبوت" لکھی اور اولیاء و بزرگان دین کے حالات و تعلیمات اور دیار ہند میں اسلام کی ترویج و اشاعت کے لئے ان کی خدمات کا مرقع "اخبار الاخیار" میں پیش کیا۔ ان کے اس اہم تذکرے سے اسلام کی عظمت اور اخلاق و تصوف کی کشش و جاذبیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس کتاب کے ادبی لسانی و تاریخی محاسن واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

شیخ عبدالحق کی طرز تحریر سے ان کی شخصیت اور تبحر علمی کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان کی عبارت سلیس و شستہ ہے اور خیالات میں کوئی ابہام و پیچیدگی نہیں ہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کو آورد کے بغیر روانی سے ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مضمون

* محلہ گھیر صلابت خاں، رام پور۔ یوپی۔

کی مناسبت سے ہی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کرتے ہیں جس کو حاصل کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ انہوں نے مواد اور طرز تحریر کے توازن کو ہمیشہ برقرار رکھا ہے اور یہ واقعی بڑا اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ کیونکہ مواد کی زیادتی کے باوجود اگر طرز تحریر دلکش نہ ہو تو پوری تصنیف پھیکی معلوم ہونے لگتی ہے اور اگر تمام زور طرز تحریر پر ہے اور مواد غیر مستند ہے تو سب کا سب بے وقعت اور غیر معتبر ہوگا۔ شیخ کی زبان و بیان کی قدرت کے لئے اخبار الاخیار کا پہلا جملہ ہی پیش کرنا کافی ہوگا جس میں خدا کی وحدانیت اور اس کی نعمتوں کا ذکر ہے اور پڑھتے ہی پہلی نظر میں "گلستان سعدی" کے دیباچہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ حالانکہ نفس مضمون کے اعتبار سے دونوں کتابیں مختلف ہیں۔

"شکر و حضرت واہب العطیات را تعالیٰ و تقدس کہ عطای او را پایان نیست و شکر الای او در حیز امکان نہ اول نعمتہا نعمت وجود ست و سائر نعم بعد از وی مشہود و نعمت وجود دائم و دوام نعمت را دوام شکر لازم پس از عہدہ شکر آن کہ بر آید تا بہ شکر نعمتہای دیگر زبان بکشاید"[1]

"گلستان سعدی" کے دیباچہ کی سطور اس طرح ہیں[2]

"منت مرخدای را عزوجل کہ طاعتش موجب قربت است و بہ شکر اندرش مزید نعمت ہر نفس کہ فرو می رود ممد حیات است و چون بر می آید مفرح ذات۔ پس در ہر نفس دو نعمت موجود است و بر ہر نعمتی شکرے واجب۔"

ان کی تحریروں میں عربی الفاظ اور فقروں کا استعمال بہ کثرت نظر آتا ہے جو قاری کے ذہن پر گراں بار نہیں ہوتا اور نہ ہی مفہوم کی ادائیگی میں حائل ہوتا ہے۔ بلکہ زور کلام اضافہ کا سبب بنتا ہے اور یہ زبان پر قدرت کی دلیل ہے۔

"..... اول آنکہ وجود اولیاء اللہ رحمتی ست شامل و نعمتی بہمہ کس واصل پس بموجب وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ذکر مناقب و فضائل ایشاں کہ در معنی شکر این نعمت عظمی و عطیہ کبریٰ ست لازم باشد و اعتقاد و صحبت این صفا کیشان واجب و متحتم... الخ"[۳]

شیخ عبدالحق نے اپنے افکار و خیالات کو ایسے اسلوب میں پیش کیا ہے جو ان ہی کا خاصہ ہو کر رہ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے اس اسلوب کو کسی خاص مطلب یا خیال ہی کو ظاہر کرنے کے لئے اختیار نہیں کیا بلکہ اس سے ان کی تحریر کی خوبی نمایاں ہوتی ہے اور اس میں جب وہ اشعار کا برمحل استعمال کرتے ہیں تو اور بھی دل کشی پیدا ہو جاتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ نثر کی ایک طویل عبارت نفس مضمون کو ادا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ مگر چند شعر یا کبھی کبھی صرف ایک ہی شعر اس طویل مضمون کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ صوفیانہ تذکروں میں تو اشعار کی شمولیت عام ہے۔ اخبارالاخیار میں بھی اس انداز بیان کو اختیار کیا گیا ہے[۴]

"اگرچہ جمال محمد در تمام آل محمد تاباں ست لیکن دراین جا جمال دیگر ست و کمال دیگر ست جمال جمال محمد ست و کمال کمال محمد اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ ..."

عالم ظہور نور کمال محمدؐ ست — آدم مثال حسن و جمال محمدؐ ست

"اخبارالاخیار" میں بعض مشائخ کے حالات کے ضمن میں مصنف نے ان کے مکاتیب کو بھی درج کر دیا ہے۔ جس سے مریدین کو دی گئی صوفیائے کرام کی تعلیمات پر روشنی پڑتی ہے۔ شیخ شرف الدین بن یحییٰ منیریؒ کے ذکر میں ان کا وہ مکتوب نقل کیا ہے جسے انہوں نے اپنے مرید و خلیفہ شیخ مظفر بلخی کو لکھا تھا اور جس میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بندگان حق کو کن کن صعوبتوں اور کیسی کیسی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سطحی اور ظاہر بین نظریں تو یہ سمجھتی ہیں کہ مصائب و آلام ہی ان کا مقدر ہے۔ مگر نکتہ داں اور

راز دروں کے آشنا اس کی حقیقت خوب جانتے ہیں، عشق حقیقی کی اپنی ایک الگ ہی شان ہوتی ہے[۵]

"اخبارالاخیار" سادہ، دل کش اور فرحت بخش طرز تحریر کا بہترین نمونہ ہے۔ مصنف کی اہم خوبی یہ ہے کہ اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ نثر میں تصنع اور بناوٹ داخل نہ ہونے پائے۔ اس میں مصنف کے اپنے مزاج کا بھی دخل ہے۔ جب وہ شاعری میں مبالغہ آرائی اور سوقیانہ طرز ادا اختیار نہیں کر سکے تو پھر درباری قصیدہ گوئی کی طرف ان کی طبیعت کیسے مائل ہو سکتی تھی۔ اس لئے ان کی نثر بناوٹی اور پُر تکلف عبارت سے پاک ہے جملوں کی ساخت اور مفہوم کی ادائیگی میں عام فہم زبان کا استعمال ہی ان کی سوانح نگاری کی مقبولیت کی اہم وجہ ہے۔

اس کتاب کی بنیادی خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصنف نے مواد کی فراہمی میں جو عرق ریزی کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر تلاش و جستجو کا جذبہ کس قدر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مصنف کبھی کسی ایسے موضوع کو ہاتھ نہیں لگاتے جس پر ان کی گہری نظر اور جس کا وسیع مطالعہ نہ ہو معمولی سی معمولی بات کے ہر پہلو پر غور کرتے تھے۔ تحقیق و جستجو کا یہ وصف حدیث و رجال میں ان کی گہری بصیرت کا نتیجہ ہے۔ ان کی تمام تصنیفات میں خواہ وہ تاریخ و تذکرہ کی ہوں یا سیر و سوانح کی۔ سب میں یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد ان کے پاس موجود ہو۔ جن کو وہ نہایت ہی دیانتداری اور محتاط انداز سے استعمال کرتے تھے۔ اس بات کو انہوں نے شرح سفر السعادۃ[۶] میں مندرجہ ذیل الفاظ میں لکھا ہے۔

"..... در تصحیح نقل و حوالہ بہ اصل مہما امکن بہ تقصیر از خود راضی نشدہ و مہمل نگذاشتہ یارب بہ سہو و نسیان در جائے وقوع یافتہ باشد ..... و دائرہ دیانت بیرون نیامدہ

وقطعاً براہ خیانت و مسائمہ نرفتہ ..... الخ"

"اخبار الاخیار" کے مطالعہ سے اس دور کے سیاسی، سماجی اور تاریخی حالات کا بھی پتہ چلتا ہے اور اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ شاہان وقت کے شیوخ و صالحین کے ساتھ کیسے روابط تھے، بعض بادشاہوں کے مشائخ و بزرگان دین سے نہایت ہی عقیدت و احترام کے تعلقات تھے اور وہ اپنے امور سلطنت میں ان کی مرضی کو مقدم رکھتے اور ان کو ارباب حل و عقد میں شامل کرتے تھے۔ جیسے سلطان شمس الدین التمش نے مولانا مجد الدین حاجی کو دہلی کا وزیر انتظامات مقرر کیا تھا۔[۸]

"سلطان شمس الدین التمش انار اللہ برہانہ او را صدر ولایت خویش ساخت و او راضی نبود تا دو سال ضبط مہمات این منصب بر وجہ اتم نمود ..... سلطان شمس الدین التماس او را مبذول داشت واز منصب صدارت او را اخلاص کرد"

شیخ محمد ترک نارنولیؒ کے ضمن میں ایک حکایت بیان کی ہے، اس سے اس دور کی تعصب پر مبنی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کا اس دور میں یا وہ ابتدائی زمانہ تھا اور اس وقت دوسری جگہوں کی طرح نارنول میں بھی مسلمان بہت کم تھے اور غیر مسلم ہر وقت ان کو تباہ و برباد کرنے کے درپے رہتے تھے۔ ایک بار عید کی نماز کے موقع پر انھوں نے نہتے مسلمانوں پر حملہ کر دیا جس کے نتیجہ میں خاصی تعداد میں مسلمان شہید ہوئے اور شیخ محمد ترک بھی اس حملہ میں شہید ہوئے۔

"..... شیخ محمد ترک نارنولی اصل او از ترکستان است و از آنجا بدیار ہند رسید و در نارنول ساکن شد ..... در اوائل اسلام کافران در نارنول قوت داشتند و مسلمانان در شہر اندک و ہندوان فرصت نگاہ میداشتند روز عید بود و در نماز یکبارگی بر سر

مسلمانان ریختند و شہید ساختند بسیار از مسلمانان دران روز بسعادت شہادت رسیدند و شیخ محمد ترک نیز ہمدران روز شہید شد ..... الخ"[۹]

سلطان شہید کا عہد خیر و سلامتی کا تھا۔ وہ بڑا نیک سیرت تھا اور اس کو علماء و صلحاء و مشائخ سے خاص رغبت تھی۔ وہ شاعر بھی تھا اور گلرخ تخلص کرتا تھا۔[۹]

"..... نمو سلطان سکندر با شاعران نشست و برخاست بسیار داشت و خود ہم صاحب طبع بود و گاہ گاہی نظمی بتخلص گلرخ بآن روشن قدیم ہندوستانیان میگفت و صحبت او بہ شیخ جمالی ازیں رہگذر خوش بر آمدہ بود ..... الخ"

لہذا سلطان سکندر کے زمانے میں عرب و عجم کے بہت سے علماء و صلحاء نے ہندوستان میں آکر سکونت اختیار کی۔[۱۰]

"..... زمان دولت سکندر زمان صلاح و تقویٰ و دیانت و امانت و علم و وقار بود ..... لہذا از اکناف عالم از عرب و عجم بعضی بسابقہ استدعا و طلب و بعضی بی آن در عہد دولت او تشریف آوردہ توطن این دیار اختیار کردند ..... الخ"

بعض سربراہان مملکت کو مشائخ و بزرگان دین سے بغض و عناد بھی تھا۔ ان کے مظالم کے واقعات جگہ جگہ بیان کئے ہیں۔ ان میں سلطان محمد بن تغلق کی شخصیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے اس نے صرف ظلم و ستم ہی نہیں ڈھائے بلکہ وہ مشائخ و بزرگان دین کو تکلیفیں پہنچا کر ایک عجیب قسم کی لذت محسوس کرتا تھا۔ جس کے لئے وہ نت نئے بہانے تراشتا۔ اکثر بزرگ اس کی اذیتوں کو چار و ناچار برداشت کرتے مگر شیخ صلاح الدین درویش جیسے بھی کچھ بزرگ گزرے ہیں، جو ہمیشہ ترش کلامی سے پیش آتے تھے۔[۱۱]

"..... آنچہ از جانب سلطان محمد بن تغلق شاہ بمشائخ از ایذا و تکلیف میرسید شیخ

"نصیر الدین آن ہمہ را بوصیت مشائخ خود تحمل میکرد و بر میداشت بخلاف شیخ صلاح الدین کہ با سلطان مذکور سخت پیش می آمد ....."

ایک بار تغلق بادشاہ نے شیخ نصیر الدین محمود کے لئے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا اس جذبے سے بھیجا کہ اگر وہ ان برتنوں میں کھاتے ہیں تو خلاف شریعت کا بہانا بناکر سزا دوں گا اور اگر کھانے سے انکار کرتے ہیں تو بھی غیر شرعی عمل کے مرتکب ہوں گے۔ ادھر شیخ کے بدخواہ الگ منتظر تھے کہ اب ان کا راستہ صاف ہوجائے گا لیکن سب کی خواہشوں پر پانی پھر گیا جب شیخ نصیر الدین نے اس میں سے تھوڑی سی یخنی ہاتھ پر لے کر چکھ لی[۱۲]

"وقتی سلطان محمد تغلق برای شیخ نصیر الدین محمود طعام فرستاد در آوندهائی زر ونقرہ و باعث فرستادن این جز ایذا نبود ... واگر بخورد گویم در کاسۂ زریں خوردی نامشروع کردی۔ شیخ ہیچ نگفت یخنی از کاسۂ زریں کہ دران بود بر آورد و بر دست نہاد ولیس بزبان نہاد و خورد ....."

مولانا عماد الدین غوری کے ضمن میں لکھا ہے کہ محمد تغلق نے ان سے کہا جب فیض الٰہی ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے تو (نعوذ باللہ) نبوت کا فیض کیسے ختم ہوسکتا ہے نبوت کے سلسلے کو جاری رہنا چاہئے۔ یعنی اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کرے اور خوارق عادات ومعجزات دکھائے تو اسے نبی تسلیم کرلینے میں کیا امر مانع ہے۔ مولانا عماد الدین نے فرمایا کہ غلاظت نہ کھائیے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ توہین سلطان محمد بن تغلق کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ اس قدر برہم ہوا کہ اس نے فوراً جلادوں کو حکم دیا کہ آپ کی زبان کاٹ لی جائے اور ذبح کردیا جائے[۱۳]

"..... می گویند کہ محمد تغلق در ایام غرور سلطنت خود گفتہ بود کہ فیض خدا منقطع نیست چرا باید کہ فیض نبوت منقطع شود و اگر کسی حالا دعویٰ نہ مولانا عماد بر نور گفت کہ گہہ مخور چہ می گوئی محمد تغلق حکم کرد کہ او را ذبح کنند و زبانش بر آید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ"

اخبار الاخیار سے قبل کے تذکروں کا پتہ نہیں چلتا۔ غالباً اس سے پہلے تذکرے کی شکل میں مستقل کتاب کی حیثیت سے درویش جمال کا تذکرہ "سیر العارفین"[۱۴] میں ملتا ہے جو افادیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ مگر یہ تذکرہ صرف تیرہ مشائخ کے حالات پر مشتمل ہے۔ جس میں چھ چشتیہ سلسلے کے بزرگ ہیں اور سات سہروردی سلسلے کے[۱۵] ان ہی کے حالات کے ضمن میں بعض دوسرے صوفیہ ومشائخ کا ذکر بھی آگیا ہے۔ اخبار الاخیار شیخ عبدالحق کے عہد تک کے تقریباً ۲۶۳ صوفیہ ۱۴ مجاذیب اور ۵ صالحات کے بارے میں معلومات کا مفید اور اہم ذخیرہ ہے۔ اس کا یہ امتیاز اس کی اہمیت کو اور بھی نمایاں کردیتا ہے کہ اس میں مجاذیب وصالحات کے حالات بھی لکھے گئے ہیں جس کی طرف اس سے پہلے کسی نے اس طرح سے توجہ نہیں دی تھی۔

حواشی

[۱] اخبار الاخیار ص ۸ [۲] دیباچہ "گلستان سعدی" ص ۲۸ [۳] اخبار الاخیار ص ۱۲ [۴] ایضاً ص ۱۱ [۵] ایضاً ص ۱۲۴ - ۱۲۵ [۶] مخطوط یونیورسٹی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کلکشن نمبر ۳۰ ف ورق ۴ [۷] اخبار الاخیار ص ۵۶ [۸] ایضاً ص ۵۰۔ نارنول کا علاقہ اس وقت پنجاب کے علاقے میں تھا۔ لیکن اب صوبہ ہریانہ میں ہے۔ یہ واقعہ بھی ۱۳۴۴ء کا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ شیخ محمد ترک نارنولی اس سانحہ عظیم میں شہید ہوئے تھے اور آپ کی وفات ۱۳۴۴ء ہے [۹] منتخب التواریخ جلد ا ص ۲۲۳ [۱۰] اخبار الاخیار ص ۲۲۳ [۱۱] ایضاً ص ۲۰ [۱۲] ایضاً ص ۸۰ [۱۳] ایضاً ص ۲۰

"سیر العارفین" ۹۳۸ھ/۱۵۳۱ء اور ۹۴۱ھ/۱۵۲۵ء کے درمیان مکمل ہوا۔[13] درویش جمالی سہروردی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ جمالی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں صحیح علم نہیں البتہ انتقال ۱۰ ذی قعدہ ۹۴۲ھ/۱۵۲۶ء کو ہوا اور وہ دہلی میں حوض شمسی کے قریب میں اپنی زندگی میں بنوائے ہوئے مقبرے میں دفن ہوئے ہیں[14]۔ [15] چشتیہ سلسلے کے بزرگ حسب ذیل ہیں (۱) خواجہ معین الدین چشتیؒ (۲) خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۳) بابا فرید الدین گنج شکرؒ (۴) خواجہ نظام الدین اولیاء (۵) نصیر الدین چراغ دہلویؒ (۶) شیخ نجیب الدین متوکل۔ سہروردی سلسلے کے بزرگ اس طرح ہیں: ۱۔ شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانیؒ ۲۔ شیخ صدر الدین عارف ۳۔ شیخ ابو الفتح رکن الدینؒ ۴۔ شیخ حمید الدین ناگوریؒ ۵۔ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ ۶۔ شیخ جلال الدین تبریزی، ۷۔ شیخ سماء الدین کنبوہؒ۔

شاہ عبدالقادر و شاہ رفیع الدین میں

پہلے کس نے قرآن کا ترجمہ کیا؟

از جناب محمد نعیم فلاحی ٭

شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین دونوں بھائیوں نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا لیکن یہ امر مختلف فیہ ہے کہ ان میں کس نے پہلے ترجمہ کیا تھا۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کا سن تالیف متحقق ہے کہ یہ ترجمہ ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، مگر شاہ رفیع الدین کے ترجمہ قرآن کا سن وثوق سے نہیں معلوم ہو سکا۔

احسن مارہروی نے شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کا سن تالیف ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء قرار دیا ہے[1] جب کہ حامد حسن قادری نے لکھا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء کے قریب لکھا گیا[2]۔ سید احتشام حسین نے اپنی تصنیف "اردو کی تنقیدی تاریخ" میں قادری صاحب کے سن کی تائید کی ہے۔ جب کہ رام بابو سکسینہ، عظیم الحق جنیدی اور نسیم قریشی نے ان کے ترجمۂ قرآن کا سن نہیں لکھا ہے۔ جن مورخین اردو ادب نے شاہ صاحب کے ترجمہ کا سن لکھا ہے، انہوں نے اپنی بات کی تائید میں کوئی سند یا حوالہ نہیں پیش کیا ہے، ظاہر ہے اس کے بغیر ان کی بات کو مستند نہیں مانا جا سکتا۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے

نوٹ:۔ حواشی مضمون کے آخر میں الگ صفحہ پر درج کر دیے گئے ہیں۔

٭ استاد شعبۂ اردو و فارسی، گورنمنٹ کالج، اجمیر۔

شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کے سن تالیف کے بارے میں "قدیم اردو" میں وثوق سے لکھا ہے:

"شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ کا سن صحیح طور پر معلوم نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے اپنی کتاب میں اس ترجمہ کا ذکر کیا ہے، ان میں سے کسی نے بھی اس کا سن نہیں لکھا۔ مولوی عبدالجلیل صاحب نعمانی نے اس ترجمہ کے لئے ایسے الفاظ کی فرہنگ شایع کی تھی جو آج کل استعمال میں نہیں آتے، اس کے دیباچہ میں وہ اس کا سن ۱۲۲۲ھ قرار دیتے ہیں، لیکن اس کی صراحت نہیں کی کہ یہ سن انہوں نے کہاں سے تحقیق کیا ہے۔ ایسی صورت میں وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سن درست ہے"[۳۳]

شاہ رفیع الدین شاہ عبدالقادر سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے، اس لئے مذکورہ مصنفین نے یہ قیاس کیا کہ پہلے شاہ رفیع الدین صاحب نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا ہوگا اور اس کے بعد شاہ عبدالقادر نے۔ لیکن ان کا یہ قیاس درست نہیں کیونکہ شاہ عبدالقادر نے اپنے دیباچہ میں صرف اپنے والد شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمہ کا ذکر تو کیا ہے، اگر اس وقت ان کے بڑے بھائی شاہ رفیع الدین کا ترجمہ ہوتا تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔ شاہ عبدالقادر اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"پر کلام اس کا عربی زبان ہے اور ہندوستانی کو اس کا ادراک محال اس واسطے اس بندۂ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم محدث دہلوی ترجمہ فارسی کر گئے ہیں، سہل اور آسان اب ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کرے"[۳۴]

مندرجۂ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شاہ عبدالقادر نے قرآن کا ترجمہ پہلے کیا تھا جیسا کہ مولوی عبدالحق نے بھی لکھا ہے:

"البتہ ایک بات ایسی ہے جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ بعد کا ہے، شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں اپنے والد شاہ ولی اللہؒ کے فارسی ترجمہ کا ذکر تو کیا لیکن اپنے بھائی کے ترجمہ کا کہیں اشارہ نہیں کیا۔ اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ اس وقت تک انہوں نے کوئی ترجمہ نہیں کیا تھا"[۳۵]

غالباً یہی ترجمہ سید نجف علی خاں فوجدار کے لئے محرک ہوا ہوگا کہ وہ شاہ رفیع الدین صاحب کے تحت اللفظ ترجمہ کو جمع کریں۔

مولوی عبدالحق صاحب نے شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کی اولیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی ہم نوائی بعض اور اہل قلم نے بھی کی ہے، چنانچہ جناب ا۔ و۔ نسیم لکھتے ہیں:

"بعض محققین کا خیال ہے کہ ان (شاہ رفیع الدین) کا ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن (تالیف سنہ ۱۲۰۵ھ) کے بعد کا ہے اور یہ اس لئے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عبدالقادر نے دیباچہ قرآن میں جہاں اپنے والد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فارسی ترجمۂ قرآن کا ذکر کیا ہے وہ وہاں اپنے برادر اکبر مولانا شاہ رفیع الدین کے اردو ترجمہ کا بھی ضرور حوالہ دیتے"[۳۶]

یہی خیال نواب صدیق حسن خاں (م سنہ ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۹ء) اور مولانا عبدالحق دہلوی (م سنہ ۱۳۳۶ھ / سنہ ۱۹۱۷ء) نے بھی ظاہر کیا ہے[۳۷]

اس کے برعکس اردو کے معروف ادیب اور صاحب "تاریخ ادب اردو" ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پہلے شاہ رفیع الدین نے قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ کیا اور اس سے شاہ عبدالقادر کو تحریک ملی اور انہوں نے پھر قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ لکھتے ہیں:

"شاہ رفیع الدین نے اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں اپنے والد کے فارسی ترجمۂ قرآن کا

ذکر تو کیا ہے لیکن شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کا ذکر نہیں کیا۔ اگر شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ان سے پہلے ہو چکا ہوتا تو شاہ رفیع الدین اس کا ذکر اپنے دیباچہ میں ضرور کرتے۔ لیکن یہی صورت شاہ عبدالقادر کے ہاں بھی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمہ کا ذکر تو کیا ہے لیکن کہیں شاہ رفیع الدین کے ترجمہ کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ اس عبارت سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاہ رفیع الدین کے تحت لفظی ترجمہ دیکھ کر انہیں یہ خیال آیا کہ اس کے معنی و مفہوم واضح نہیں ہوئے۔ اس لئے ایسا ترجمہ کرنا چاہیے جس سے معنی قرآن آسان ہو جائیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ سے مقدم ہے اور چونکہ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ۱۲۰۵ھ / ۱۷۹۰ء میں مکمل ہوا اس لئے شاہ رفیع الدین کا ترجمہ ان سے چند سال قبل ۱۲۰۰ھ / ۱۷۸۵ء یا اس سے کچھ پہلے مکمل ہوا ہوگا۔[۸]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے شاہ رفیع الدین کے جس دیباچہ کا ذکر کیا ہے، اس کا نہ تو کوئی حوالہ دیا ہے کہ پتہ چلتا کہ اس کی اصل عبارت کیا ہے؟ انہوں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ شاہ رفیع الدین صاحب کا دیباچہ ان کے ترجمۂ قرآن کی کس اشاعت میں شامل ہے، شاہ رفیع الدین صاحب کا جو ترجمہ قرآن میری نظر سے گذرا ہے اس پر ان کا کوئی دیباچہ نہیں بلکہ اس پر دیباچہ ناشر کا لکھا ہوا ہے۔[۹] اسی طرح تفسیر رفیعی پر بھی ان کا کوئی دیباچہ نہیں ہے۔ اس کا دیباچہ سید نجف علی کے صاحبزادے[۱۰] اور اس تفسیر کے ناشر عبدالرزاق نے لکھا ہے۔

موصوف نے شاہ عبدالقادر کے دیباچہ سے ایک اقتباس نقل کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ شاہ عبدالقادر نے بڑے بھائی شاہ رفیع الدین کا نام لئے بغیر ان کے ترجمہ کی

طرف اشارہ کیا ہے۔ حالانکہ دیباچہ سے جو بات قطعی طور پر واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اب تک فارسی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ ہوا ہے اور یہاں کے عام باشندے اس زبان سے واقف نہیں ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر انہوں نے ہندی یا اردو زبان میں یہ ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی رائے مدلل بنانے کی ضرور کوشش کی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خود انہیں بھی اپنے دلائل پر اطمینان نہیں ہے، اس لئے ہمارے خیال میں ان کی رائے بھی وزن سے خالی ہے۔

گو شاہ عبدالقادر صاحب شاہ رفیع الدین صاحب سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن اردو ترجمہ میں اولیت کا شرف ان کو حاصل ہوا۔ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہو کر مسجد اکبر آبادی میں گوشہ نشین ہو گئے تھے، ان کی تمام ضروریات ان کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیز صاحب پوری کرتے تھے۔ وہ مسجد سے بہت کم باہر نکلا کرتے تھے اور قرآن مجید سے بالخصوص ان کو گہرا شغف تھا اور اس کا ترجمہ ہی ان کی زندگی کا ماحصل تھا۔ ان کی فراغت، یکسوئی اور شغف کی وجہ سے یہی خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ اولیت شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو حاصل ہے۔

اس کے مقابلے میں شاہ رفیع الدین صاحب کو اوائل عمر ہی میں مختلف ذمہ داریوں کا بار اٹھانا پڑا تھا۔ وہ تعلیم سے فراغت کے بعد تدریس میں منہمک ہو گئے تھے اور جب شاہ عبدالعزیز صاحب کو مختلف بیماریوں نے آ گھیرا تو مدرسہ شاہ ولی اللہ کی صدر مدرسی اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس کا بار ان کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ان مشغولیتوں کے ساتھ قرآن مجید کے ترجمہ کے کام کے لئے وقت اور فرصت نکالنا

ایک دشوار امر تھا۔ اس لئے شاہ رفیع الدین نے اپنا ترجمہ خود نہیں قلم بند کیا بلکہ ان کے ایک شاگرد سید نجف علی خاں نے اپنے استاد سے پڑھ کر اسے لکھنے کی اجازت مانگی اور لکھنے کے بعد شاہ رفیع الدین صاحب کی خدمت میں تصحیح کے لئے پیش کیا اور انہوں نے اس کی تصحیح بھی فرمادی۔

حواشی

[1] تاریخ نثر اردو، احسن مارہروی ص ۷۷، [2] داستان تاریخ اردو، حامد حسن قادری ص ۵۴ [3] قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۱۴ء تک، سید حمید شطاری ص ۱۴۲ [4] موضح قرآنی شاہ عبدالقادر مطبوعہ میر حسن رضوی لکھنؤ ۱۲۶۷ھ ص ۳۷۹ [5] اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ، محمد ایوب قادری ص ۶۱ [6] قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ص ۱۴۳ [7] اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ ص ۶۱ [8] تاریخ ادب اردو جلد دوم جمیل جالبی ص ۱۰۵۲ [9] اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ ص ۶۲-۶۱۔

تذکرۂ مفسرین ہند اول

مرتبہ مولوی محمد عارف عمری۔

اس جلد میں آٹھویں نویں صدی ہجری سے بارہویں صدی ہجری کے آخر اور شاہ ولی اللہ صاحب سے قبل کے سو[16] اصحاب تصنیف مفسرین کا تذکرہ اور ان کی تفسیروں کا تعارف کرایا گیا ہے۔

قیمت ۶۰ روپے

تعلیم القرآن

مولفہ محمد اویس ندوی۔

یہ رسالہ مولوی ثناء اللہ صاحب مرحوم رئیس گورکھپور کی فرمائش پر لکھا گیا تھا جس میں مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کے لئے دل نشیں انداز میں قرآن کی دینی، اخلاقی تعلیمات لکھی گئی ہیں۔ قیمت ۲۵ روپے۔

تلخیص وتبصرہ

ساحل العاج

از کلیم صفات اصلاحی

ساحل العاج مغربی افریقہ میں واقع ساحل گیانا کا ایک ملک ہے جس کے شمال میں فولٹا مالی اور اس سے متصل خلیج گیانا اور بحر اٹلانٹک ہے۔ اس کو مشرق سے غانا، مغرب سے گیانا اور لیبیریا گھیرے ہوئے ہے۔

ساحل العاج[1] کا کل رقبہ ۳۲۲۴۶۲ مربع کیلو میٹر ہے اور آبادی ۷۹۵.... کے قریب ہوگی۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کے سواحل پر افریقی تاجر ہاتھی کے دانت کا بیوپار کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے، بعد میں یہ جگہ "تجار العاج"، کے نام سے مشہور ہوگئی۔ گذشتہ صدی کے نصف اول میں ساحل العاج کا علاقہ فرانسیسی سامراج کے زیر تسلط تھا۔ ۱۹۶۰ء میں یہ ملک آزاد ہوگیا۔

اسلامی اعداد وشمار کے مطابق ساحل العاج کے ۵۰ بز باشندے مسلمان ہیں۔ جب کہ یورپین مصادر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پر مسلمانوں کی آبادی چوتھائی ہے۔ لیکن اول الذکر بیان ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ساحل العاج کا دارالسلطنت ابید جان ہے۔ اس کا شمار مشرقی افریقہ کی اہم بندرگاہوں میں ہوتا ہے۔ دوسرے اہم شہر بواجی وجاجنوا ہیں۔ مسلمان تاجروں نے اس ساحل کی ساخت وہیئت دیکھ کر اس کو "الباسس العظیم" کا نام دیا۔

[1] عاج عربی میں ہاتھی کے دانت کو کہتے ہیں۔ مترجم

ساحل العاج کے رقبہ کا تہائی علاقہ ہموار ساحلی زمینوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد بحیرہ کی طرف سطح زمین مرتفع ہے۔ پھر شمال سے جنوب تک متعدد نہریں رواں ہیں۔

یہاں کے اکثر باشندے سیاہ فام اور حبشیوں جیسے ہوتے ہیں لیکن کچھ سفید فام بھی ہیں۔ ان کی اکثریت مختلف قبائل سے پیوستہ ہے جن میں باولی، اجنی، موشی، ماندی، بمبارا، لنکی، سوفو، سوننکی، دیولا اور قبیلۂ صنفای کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ساحل العاج کا ایک گروہ "کمرو" زبان بولتا ہے۔ یہ خلیج گیانا کے علاقوں کی خاندانی زبان ہے جو "کوا" کے نام سے اس علاقہ میں مشہور ہیں۔ دوسرا گروہ "توی" زبان بولتا ہے اور اس زبان کے بولنے والے پورے ساحل العاج میں پھیلے ہوئے ہیں۔

قبیلۂ ماندی اور دیولا کے افراد زراعت پیشہ ہیں۔ ان کی اکثریت مسلمان ہے۔ بعض لوگوں کو کارخانوں، تجارتوں اور علاقائی نظم وضبط سے دلچسپی ہے۔ ساحل العاج کے کچھ علاقوں میں قبائلی نظام بھی رائج ہے۔ مثلاً دلیف کے اطراف میں۔

قبیلۂ صنفای کے لوگ حبشی نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کی طبعی خصوصیات میں شمال کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ اس کے افراد دوسرے مسلم قبائل ماندی اور دیولا سے قریب تر ہیں جو مذہب اسلام کو مانتے ہیں۔ شمالی حصہ میں فولانی، بربر اور عرب کے متعدد قبائل کا غلبہ ہے۔ ساحل العاج کی زرخیزی کی وجہ سے اس کے جوار کے حبشی ممالک فولٹا العلیا وغیرہ سے بہت سارے لوگ آکر یہاں آباد ہوگئے ہیں۔ فرنچ وہاں کی سرکاری زبان ہے۔ اس کے شمالی اطراف کے اسلامی مدرسوں میں عربی زبان پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن ان کے لہجے مختلف ہیں بمبارا لہجہ زیادہ مقبول ہے۔

ساحل العاج کی معاش کا دارومدار زراعت پر ہے اور یہی وہاں کے باشندوں کا

اصل پیشہ ہے۔ زرعی ترقی کی وجہ سے یہ ملک فارغ البال اور دولت مند ہے۔ ساحل العاج کی زرعی برآمدات میں مطاط[1]، چاول، کیلا، کاکاؤ[2]، گنے کی کاشت، روئی وغیرہ شامل ہیں۔ لکڑیوں کے کاروبار سے بھی اس ملک میں دولت کی فراوانی ہے۔ قصدیر[3]، سونا، لوہا اور تانبا وغیرہ ساحل العاج کی خاص معدنیات ہیں۔ اس کے علاوہ غذائی مصنوعات بھی تیار کی جاتی ہیں۔

ساحل العاج میں اسلام کی آمد

ساحل العاج دراصل مغربی سوڈان کے اسلامی تہذیب وثقافت کے علمبردار ممالک میں گیانا کا ایک حصہ ہے۔ جس کے افق پر شمالی راستہ سے مسلم تاجروں کے وسیلے سے اسلام کی کرنیں پڑیں۔ یہ تاجر ٹمبکٹو سے مسلم ملک "ملی" ہوتے ہوئے اس دیار میں وارد ہوئے تھے۔ انہوں نے ساحل العاج کے جنوبی علاقوں میں بھی اسلام کی نشرواشاعت کی۔ کیونکہ ساحل العاج کے جنوبی حصے اور نائیجیریا کے متعدد شہروں جنی اور ٹمبکٹو کے مابین تجارتی روابط عرصہ سے قائم تھے۔ علاوہ ازیں یہ علاقہ فولا، ہوسہ اور ماندنج کے مسلم تاجروں کی تجارتی سرگرمیوں کا خاص میدان تھا۔ جس کے نتیجہ میں وہاں دعوت اسلامی کی نشوونما اچھی طرح ہوئی۔ پھر بت پرست قبائل اجنی، شانتی اور باؤل وغیرہ کے متعدد حبشی وفود بھی ساحل العاج میں داخل ہوگئے۔

انیسویں صدی کے نصف اول میں ساحل العاج پر یورپین سامراجیوں کا غلبہ ہوا۔ فرانس نے ۱۸۴۲ء میں جنوب سے اس پر حملہ کیا اور جنوبی حصے اس کے تسلط میں آگئے۔

---

[1] اونٹ کا کڑوا اور کھارا دودھ [2] خط استوا پر واقع علاقوں کی پست زمین میں اگنے والا چھوٹا پھل دار درخت جس کے پتے چوڑے اور پھول چھوٹے ہوتے ہیں۔ اسی سے معجون شوکولا تا بھی بنایا جاتا ہے [3] سفید ملائم چاندی جیسی دھات جو ڈھلائی کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ (مترجم)

گو اس کے شمالی حصے کی اسلامی مملکت نے ان کا مقابلہ کیا مگر فرانسیسی حملے کی تاب نہ لاسکا اور ۱۸۹۳ء میں یہ بھی اس کا باجگذار ہوگیا۔ پھر عیسائی مشنریاں اس کے سائے میں سرگرم ہوگئیں مگر اسلام کے اثر و نفوذ کو نہ روک سکیں جو وہاں کے بت پرست قبیلوں میں گھر کرچکا تھا۔ بعض مصادر و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں ساحل العاج نور اسلام سے منور ہوا ہوگا۔

یہاں کے مسلمان زیادہ تر مالنکی، دیولا، بمبارا، موشی، سنوفو، وتکی، فولانی، ہولہ، ولوف، صفانی، بربر اور عرب قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ قبیلہ ماندنج کے مسلمانوں کی اکثریت ساحل العاج میں اقامت گزیں ہے اور انہی کے قریب موشی اور سنوفو قبیلہ بھی ہے۔

مساجد اور اسلامی مدارس مسجدیں زیادہ تر گاؤوں اور ساحل العاج کے شمالی شہروں میں واقع ہیں۔ مدارس میں عربی زبان پڑھائی جاتی ہے جن میں حفظ قرآن کا شعبہ ہے مگر اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں ہے۔ ملک کی آزادی تک یہی حالت تھی مگر اس کے بعد احمد تیجانی نے جن کی اسلامی تعلیم تونس میں ہوئی تھی، یہاں پہلا اسلامی مدرسہ قائم کیا، جس کا نہج تعلیم درس نظامی کے مطابق تھا۔ اس مدرسہ کا نام ۱۹۵۶ء میں "مدرسۃ التہذیب الاسلامی" رکھا گیا۔ اس کے بعد بعض اور دینی مدارس بھی کھلے۔

۱۹۶۰ء میں شیخ زبیر ابولادی نے بچوں کی ابتدائی عربی زبان کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۶۲ء میں حاجی مرتضیٰ عبدالناصر نے ابید جان میں ایک اسلامی عربی درس گاہ کی بنیاد ڈالی جس میں طلبہ کو علوم دینیہ، فقہ، حدیث، تجوید وغیرہ

پڑھائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مدرسہ کے طلبہ پر اسلامی تہذیب و ثقافت کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ انگریزی، عربی زبان و ادب، تاریخ، جغرافیہ کے علوم سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش بھی جاری ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب وہاں علمی و تعلیمی بیداری کا آغاز ہوگیا ہے۔

اسلامی مراکز ساحل العاج میں اسلامی مراکز کثرت سے پائے جاتے ہیں، جو وہاں مذہب اسلام اور اسلامی علوم و فنون کی اشاعت کا کام انجام دے رہے ہیں۔ جامع مسجدوں کی تعداد ۴۰۰ ہے اور حفظ قرآن کے ۱۲۰۰ مدرسے پوری آب و تاب کے ساتھ چل رہے ہیں۔ بعض مدارس میں ابتدا سے ثانوی تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ آزادی کے بعد وہاں کے مسلمانوں میں دینی رجحان بڑھ رہا ہے۔

(ماخوذ: التضامن الاسلامی، مکہ مکرمہ)

اگست ۱۹۹۰ء

وفیات

اردو کا سردار چلا گیا

مدت سے اردو کا گلشن صیادوں اور گلچینوں کے نرغے میں ہے، باد حوادث بھی اس میں خاک اڑا کر اسے ویرانے میں تبدیل کرنے کے درپے ہے، اردو کے پرانے بادہ کش اٹھتے جارہے ہیں۔ ابھی مجروح سلطان پوری کے غم میں آنسو تھمے نہیں تھے کہ یکم اگست کو اردو کا بہت ممتاز اور قدآور شخص بین الاقوامی شہرت کا حامل انقلابی شاعر، وسیع النظر ادیب و نقاد، اچھا مقرر و خطیب اور ترقی پسند تحریک کا میر کارواں، سید علی سردار جعفری بھی چل بسا۔ جس کے جانے سے اردو کی دلکش اور رنگارنگ گنگا جمنی تہذیب کا خاتمہ ہوگیا اور اردو دنیا میں ویرانی اور تاریکی چھا گئی، اردو والے بے قرار ہو کر کہہ رہے ہیں ع اس غم کی تلافی کیا ہوگی، اس درد کا درماں کیا ہوگا۔

جناب سید علی سردار جعفری کے بزرگ ریاست بلرام پور میں اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ اسی لیے ان کا خاندان آگرہ سے بلرام پور چلا آیا تھا۔ یہیں نومبر ۱۹۱۳ء میں سردار کی ولادت ہوئی اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی، وہ طلبہ کے لیڈر بھی رہے، اس وقت ملک میں قومی اور سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں، ہر طرف سرفروشان وطن نے انگریزوں کے خلاف پرچم بغاوت بلند کر رکھا تھا اور پورا ملک انقلاب کے نعروں اور آزادی کے ترانوں سے گونج رہا تھا۔ سردار بھی اقبال سہیل کا یہ رجز پڑھتے ہوئے آزادی کے دیوانوں کے لشکر میں جا ملے۔

[1] افسوس ہے کہ ابھی تک معارف میں ان پر کوئی تحریر شائع نہیں ہوسکی۔ ان کی غزل گوئی پر مفصل مضمون لکھنے کا خیال تھا جس کے لیے فرصت کا منتظر ہوں۔ "ض"

قید غلامی و حیات ننگ ہے ننگ کائنات — لعنت بندگی کے ساتھ صورت زندگی نہ دیکھ
پھاڑ کے جیب و آستیں کر علم جنوں بلند — عشق کے میر کارواں پرچم خسروی نہ دیکھ

ابتدا ہی سے وہ مارکس کے خیالات سے متاثر تھے جو برابر ان کی شاعری پر بھی چھائے رہے، ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی سربراہی میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی تو وہ اس میں شامل ہو گئے، اور اپنی انقلابی شاعری سے مجاہدین آزادی کے دلوں میں فرنگیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھارتے رہے، وہ ترقی پسند تحریک کو جنگ آزادی ہی کا ایک بازو سمجھتے تھے، اس کے زیر اثر ان کے انقلابی خیالات اور انگریزوں کے خلاف باغیانہ جذبات میں مزید شدت پیدا ہوئی اور وہ عمر بھر اس تحریک کو قوت و توانائی دیتے اور اس کے ادبی سرمایے کو مالا مال کرتے رہے، "ترقی پسند ادب" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کی اشاعت اور سجاد ظہیر کے انتقال کے بعد ترقی پسند تحریک کی نظریاتی باگ ڈور عملاً انہی کے ہاتھ میں آگئی تھی، ان کے خیال میں ترقی پسند تحریک میں سوویٹ یونین کے زوال کے بعد بھی کوئی بکھراؤ نہیں ہوا، البتہ تحریک کے ابتدائی دور میں جس پایے کے شاعر اور افسانہ نگار پیدا ہوئے بعد کی نسل میں اس پایے کے لوگ نہیں پیدا ہوسکے مگر اس کو وہ اس عجیب و غریب تاریخی عمل کا نتیجہ بتاتے ہیں جس میں بہار کے بعد خزاں اور خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں ادب اور معاشرہ خزاں کے دور سے گزر رہا ہے جو نئی بہار کی آمد کا اعلان ہے۔

وہ ۱۹۴۲ء میں ممبئی گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے، چنانچہ جوہو قبرستان ان کا مدفن بنا، ممبئی میں وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے اور متعدد فلموں کے لیے گیت، مکالمے اور منظرنامے لکھے، مگر اس کی چمک دمک سے ان کی نگاہیں خیرہ نہیں ہوئیں، انہوں نے شعر و ادب کا وقار اور رکھ رکھاؤ قائم رکھا۔

سردار اردو کے ادبی افق پر نصف صدی سے زیادہ عرصے تک چھائے رہے، نظم و نثر

میں یکساں ان کا قلم رواں رہا، جس زمانے میں شعر گوئی شروع کی اسی زمانے میں نثر نگاری بھی شروع کی اور افسانے اور ڈرامے لکھے، ان کا پہلا افسانہ "عالم گیر" میں اور پہلا ڈرامہ طالب علمی کے زمانے میں "علی گڑھ میگزین" میں شایع ہوا۔ متعدد ادبی، تنقیدی اور سوانحی مضامین بھی لکھے اور شاعری کی طرح اپنی نثری نگارشات سے بھی ترقی پسند تحریک کو تب و تاب عطا کی، نثر نگاری کا انہیں اچھا سلیقہ تھا، وہ بڑی اچھی اور خوب صورت نثر لکھتے تھے، ان کا خاص اور منفرد اسلوب نگارش تھا، ان کی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" ان کی نثر کا دلآویز نمونہ ہے، ان کی پہلی نثری کتاب افسانوں پر مشتمل تھی جو "منزل" کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شایع ہوئی، میر، غالب، میرا بائی اور کبیر کے انتخابات اردو اور ہندی دونوں میں اپنے مقدمات کے ساتھ شایع کئے جو بعد میں "پیغمبران سخن" نام کی کتاب میں شامل ہوئے۔ اس سے ان کی تنقیدی ژرف نگاہی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ حافظ، رومی، غالب اور اقبال کے عاشق تھے، ان کے اکثر اشعار ان کو یاد تھے "اقبال شناسی" ان کی مشہور کتاب ہے، "ترقی پسند ادب" تاریخی اہمیت کی حامل کتاب ہے، جس کے حوالے کے بغیر ترقی پسند ادبی تحریک کی کوئی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی۔ انہوں نے دوسرے اہل قلم اور مصنفین کی کتابوں پر جو دیباچے اور مقدمے لکھے ہیں وہ بھی ان کے حسن نگارش اور سلاست و برجستگی کے دلکش نمونے ہیں۔

نثر کے مقابلے میں ان کی طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف زیادہ رہا، غزل میں بھی فکر سخن کی ہے، مگر ان کا جوہر نظموں میں زیادہ کھلتا تھا، زبان و بیان پر پوری قدرت تھی اور فن کی نزاکتوں اور باریکیوں سے اچھی طرح واقف تھے، ان کی نظمیں اپنے جلال و جمال کی وجہ سے اردو شاعری میں جاوداں رہیں گی۔ ان میں انسان دوستی، اور انسان سے محبت، عام لوگوں کے دکھ درد، امن اور صلح و آشتی کو اصل موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی شاعری سامراجیت، جبر و استبداد اور طبقاتی امتیاز کے خلاف ایک للکار معلوم ہوتی ہے جس سے وہ ہندوستان ہی نہیں ایشیا بلکہ دنیا کی پس ماندہ تمام اقوام کو بیدار کرنا چاہتے تھے اور غریب،

مزدور، محنت کش طبقہ اور دبے کچلے عوام کے دلوں میں انقلاب کی شمع روشن کر کے ان کو ہمت و حوصلہ اور طاقت و جرأت عطا کرنا چاہتے تھے۔

ان کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو حسین پیکر تراشی بھی ہے۔ "نئی دنیا کو سلام"، "پتھر کی دیوار" اور "اودھ کی خاک حسین" جیسی نظمیں پیکر تراشی کے کامیاب نمونے ہیں۔

جعفری صاحب ظلم و ناانصافی، فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے خلاف نبرد آزما ہونے کے علاوہ کمزور اور پس ماندہ لوگوں اور اقلیتوں کے حقوق و مفاد کے لئے زندگی بھر جد و جہد کرتے رہے، ملک کی تقسیم، بابری مسجد کے انہدام اور ان دونوں واقعات کے بعد ہونے والے فسادات سے وہ بہت دل گیر اور دل شکستہ تھے، بابری مسجد کے انہدام کے خلاف بڑی جرأت و بے باکی سے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا اور اس پر نظم بھی لکھی۔

ہند و پاک کی دوستی ان کی شاعری کا اہم موضوع تھا، اپنی مشہور نظم "سرحد" میں بتایا ہے کہ سرحد مصنوعی اور انسان کی خود ساختہ ہے، اس سے ہمیں کیا غرض؟ ہمارا تو پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ ۹۸ء میں وزیر اعظم باجپائی بس سے لاہور گئے تو اس نظم کو بھی اپنے ساتھ لے گئے، اس میں سردار کہتے ہیں:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبحِ آزادی

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

ہند و پاک دوستی کے موضوع پر ان کی کئی نظمیں ہیں، جن میں "صبح فردا" اور "دشمن کون" وغیرہ بہت مشہور ہوئیں۔ ایک نظم "گفتگو بند نہ ہو" بھی ہے۔

گفتگو بند نہ ہو بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

۹۸ء میں دونوں ملکوں میں ایٹمی دھماکے ہوئے تو ان کی امن و آشتی پسند طبیعت کو بڑا دھکا لگا

اور انہوں نے اس کی شدید مذمت کی۔

رعنائی خیال اور ذوق جمال کی کارفرمائی کے باوجود ان کی غزلیں حسن و عشق کی فرسودہ داستان نہیں بلکہ انسانی زندگی کے مسائل و مشکلات کی ترجمان ہیں، انہوں نے اردو کی کلاسیکل روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان میں اپنے انقلابی افکار کو بڑی خوبصورتی سے سمو دیا ہے۔

سردار جعفری کے کلام کے کئی مجموعے شایع ہوئے اور بہت مقبول ہوئے، ان کی نظموں کا سب سے پہلا مجموعہ ۱۹۴۳ء میں "پرواز" کے نام سے چھپا، ملک کے علاوہ دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں ان کے کلام کے ترجمے کئے گئے، اسی لئے وہ دنیا کے اکثر ملکوں میں روشناس تھے اور اردو کی طرح دوسری زبان والوں میں بھی محبوب و مقبول تھے، انہوں نے کئی بیرونی ملکوں کے سفر بھی کئے اور ہندوستان کے بڑے شاعروں کی طرح ترکی اور یورپ کے ملکوں کے شعراء سے متاثر بھی تھے، اردو اور ہندی کو قریب لانے کے لئے انہوں نے جو کوششیں کیں ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، قرۃ العین حیدر کے ساتھ مل کر غالب کے اردو کلام کا انگریزی ترجمہ بھی کیا تھا۔

سردار کئی زبانوں سے واقف تھے اور غالباً ہندی اور سنسکرت پر عبور رکھتے تھے، مگر ان کی تگ و تاز کا اصل میدان ان کی مادری زبان اردو ہی تھی جس سے ان کو عشق تھا، اسی زمین میں وہ تا عمر گل بوٹے کھلاتے رہے اور اس وقت وہ اس زبان کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے تھے، وہ اس کی خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، زندگی کے آخری لمحے تک اسے وقار و افتخار عطا کرنے میں برابر سرگرم، متحرک اور فعال رہے۔

اردو ہی کی طرح طویل عرصے تک گوناگوں خدمات کی بنا پر ان کو بڑے بڑے اعزازات سے نوازا گیا، پدم شری خطاب ملا، اردو اکیڈمیوں، ریاستی و مرکزی حکومتوں اور مختلف اداروں کے کئی درجن ایوارڈ کے علاوہ حکومت کے سب سے بڑے ایوارڈ گیان پیٹھ سے سرفراز کئے گئے۔ ۶۷ء میں سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ ملا، ۷۷ء میں پاکستان میں اقبال میڈل پیش کیا گیا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری سے نوازا۔

آزادی کے بعد اردو کے ساتھ جو معاندانہ رویہ اختیار کیا گیا اس کی انہیں بڑی تکلیف تھی اور وہ اس کی

بقا و ترقی کی جانب سے فکرمند رہنے لگے تھے، ان کے خیال میں تعلیمی نظام اور نظم و نسق سے الگ ہو جانے کے بعد یہ ایک تفریح بن کر رہ گئی ہے، اردو رسالے، بیشتر کتابیں، مشاعرے، ریڈیو اور ٹی۔ وی وغیرہ اس حقیقت کے گواہ ہیں، وہ کہتے تھے کہ دوسری زبانوں میں جو آہنگ اور موضوع ہے، وہ اردو میں باقی نہیں رہ سکا ہے، اب کتابیں بھی پانچ سو اور چھ سو کی تعداد میں شایع ہوتی ہیں۔ غالباً اردو کے بقا و ارتقا کے مسئلے میں تشویش ہی کی وجہ سے ایک دفعہ انہوں نے اردو رسم الخط کے معاملے میں ایک متنازعہ بیان دے دیا تھا جس میں ان کی بدنیتی تو نہیں تھی مگر اس سے رسم الخط بدلنے والوں نے فائدہ اٹھایا۔

مرکزی حکومت نے کئی برس پہلے اردو کو فروغ دینے کے لئے گجرال کمیٹی کی تشکیل کی، اس کی سفارشات پر نظر ثانی کے لئے جعفری کمیٹی بنی، مگر اس کی سفارشات پر نہ سیکولر حکومتوں کے دور میں عمل ہوا اور نہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے۔ سردار کے محب وطن اور سیکولر ہونے کا اعتراف ان کے دوست اندر کمار گجرال اور سماج وادی پارٹی کے رہنما امر سنگھ کی طرح وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی اور وزیر اطلاعات ارون جیٹلی کو بھی ہے۔ جعفری صاحب کو بہترین خراج عقیدت یہ ہے کہ حکومت ان کی محبوب زبان کی بقا و ارتقا کا سامان کرے اور اس کے معاملے میں فراخ دلی سے کام لے۔

سردار جعفری بڑی وجیہ اور دلکش شخصیت کے مالک تھے، ان کی سیرت کا اصل جوہر ان کی شرافت، محبت، دل نوازی، انسان دوستی اور حسن اخلاق تھا، میری ان کی ملاقات چند بار ہی کی ہے مگر ابھی تک اس کے لطف و لذت سے سرشار ہوں۔ وہ دل کو موہ لینے والی باتیں کرتے تو جی چاہتا تھا کہ ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

اللہ تعالیٰ اردو کے اس شیدائی، باکمال شاعر و ادیب اور شریف انسان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرمائے آمین!!

"ض"

باب التقریظ والانتقاد

نظام رام پوری۔ حیات اور شاعری

از پروفیسر محمد طیب انصاری *

ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی اردو کے اچھے اہل قلم ہیں، ان کے ادبی و تحقیقی مضامین مختلف رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں اور ان کی بعض کتابیں بھی چھپ کر منظر عام پر آگئی ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں "نظام رام پوری، حیات اور شاعری" مرتب کی ہے۔ یہ کتاب خاصہ کی چیز ہے۔ گو یہ کتاب مرتبہ ہے لیکن تحقیقی حیثیت سے کمتر نہیں ہے۔ اس کی وجہ نظام رام پوری کی بازیافت ہے اس کتاب کی اشاعت سے نہ صرف نظام کے معاصرین شعراء کی قلعی کھل گئی بلکہ نظام کے ادبی مرتبہ کا تعین ممکن ہو سکا۔ نظام کے اشعار عام لوگوں کی زبانوں پر تھے اور رام پور کی گلی کوچوں میں پڑھے جاتے تھے۔ جن کو پڑھ کر لوگ عش عش کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ بے دیوان اس جہان فانی سے اٹھ گئے۔ ان کے بعد بیشتر معاصر شعراء نے ان کی زمینوں پر اپنی شہرت کی بلند و بالا عمارتیں کھڑی کیں۔ ان شعراء میں داغ کا نام سب سے زیادہ داغ دار ہے! آگے اس کی کسی قدر تفصیل آرہی ہے۔

شعائر اللہ خاں نے نظام رام پوری کی حیات اور شاعری سے متعلق دوسرے اہل قلم کے مضامین کو کتابی صورت دے کر ایک اہم ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔ جس کے لئے وہ بجا طور پر مبارکبادی کے مستحق ہیں۔ اس سے بقول ان کے نظام فہمی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگا۔ (ص ۱۹)

---

* المنیرہ، نودہ کا، بھنم، حیدرآباد۔

ڈاکٹر شعائر اللہ خاں کی تحقیقی کدوکاوش کا اندازہ ان کے اس پیش لفظ یا مقدمہ سے پوری طرح ہوتا ہے جو انہوں نے "نظام ہمیں خوب یاد آئے" کے زیر عنوان سپرد قلم کیا ہے۔ رام پور میں نظام کا طوطی بولتا تھا، مگر ان کے بھولی بسری کہانی بن جانے کا فائدہ ان کے ہم عصر شعراء نے خوب اٹھایا۔ توارد کے نام پر سرقہ ہوا۔ اس اجمال کی تفصیل "نظام رام پوری حیات اور شاعری" میں ملے گی۔ ولدار نصری نے اپنے مقالہ میں فائق رام پوری کے حوالے سے غالب کے شعر سے متوارد (؟) ہونے کی بات کہی ہے۔ شعر درج ذیل ہے:

دردِ دل کا علاج ہو کس سے	یوں مسیحا ہوا کرے کوئی	(نظام)
ابن مریم ہوا کرے کوئی	میرے دکھ کی دوا کرے کوئی	(غالب)

اور شعر کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا: "... نظام نے "درد دل کا علاج" کہا ہے جو فصاحت دکھتا ہے"۔ (ص ۶۷)

فرحت شاہ جہاں پوری نے اپنے مقالہ "نظام رام پوری اور داغ دہلوی" میں لکھا ہے "داغ نے نظام کی بہت سی زمینوں میں اپنی غزلیں کہی ہیں۔ گلزار داغ خصوصاً اس کا آئینہ دار ہے"۔ فرحت نے اس کے ثبوت میں بے شمار اشعار نقل کئے ہیں۔ چند شعر آپ بھی ملاحظہ کریں۔

آج کہتے ہو، مدعا کہیئے	اس تغافل کو کہیئے، کیا کہیئے	نظام
ناروا کہیئے ناسزا کہیئے	کہیئے کہیئے مجھے برا کہیئے	داغ
مزا کیا جو یوں ہی سحر ہوگئی	نہیں بھی پھر دوپہر ہوگئی	نظام
جہاں لگ گئی کارگر ہوگئی	مری آہ تیری نظر ہوگئی	داغ
جب سے اس بت پہ طبع آئی ہے	دشمن جاں مری خدائی ہے	نظام

دل چرا کر نظر چرائی ہے   لٹ گئے لٹ گئے دوہائی ہے   داغ

توارد کا یہ مسئلہ صرف داغ کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ ناظم، بیمار، جرأت، امیر مینائی اور ریاض خیر آبادی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

نظام کا مزاج عاشقانہ تھا اس لئے ان کی غزل ان کے اپنے تجربات کی عکاس ہے، ان کا معاشقہ بدنامِ زمانہ تھا اور رام پور میں خوب چرچے تھے۔ ان کا رنگ سخن یہ تھا:

بتوں کے عشق سے توبہ تو کی ہے پر نظام اب بھی   جو صورت اچھی ہوتی ہے طبیعت آ ہی جاتی ہے

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہات   دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہات

انداز اپنے دیکھتے ہیں آئینے میں وہ   اور یہ بھی دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

نظام کے اسی رنگ تغزل نے امیر مینائی کو یہ کہنے پر مجبور کیا:

"بڑے خوش فکر و خوش مذاق، شعر عاشقانہ کہنے میں طاق!"

گناہ بشریت کا تقاضا ہے۔ نظام نے توبہ کی اور تقویٰ و زہد اختیار کیا۔ اب جو زبان سے شعر نکلے وہ حبِ رسول میں ڈوبے اور یادِ الٰہی میں سرشاری کی وجہ سے معطر اور پاکیزہ!! نظام کا رنگ شاعری بدل گیا۔ وہ اپنا عہدِ جوانی لغویات میں برباد نہ کئے ہوتے تو کم از کم اردو کے حافظ و خیام ضرور ہوتے! وحدت الوجود کے بہت سے شعرا قائل رہے ہیں۔ شعر بھی کہے ہیں مگر اس مرتبہ کا شعر کہاں سے لائیں گے!

اگر خود نما وہ خود آرا نہ ہوتا   یہ نیرنگ قدرت ہویدا نہ ہوتا

تشخص ہے باعث جدائی کا ورنہ   یہ قطرہ ہم آغوشِ دریا نہ ہوتا

عبد الہادی خاں کاوش نے نظام کی صوفیانہ شاعری پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

شعائر اللہ خاں نے زیر نظر کتاب مرتب و شایع کر کے اصحاب شعر و ادب کی دلچسپی کا سامان مہیا کیا ہے جس کے لئے وہ تحسین کے مستحق ہیں کتاب کی قیمت ۹۰ روپے ہے اور پتہ یہ ہے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶۔

ادبیات

چہار غزلہ

از ڈاکٹر ولی الحق انصاری ٭

"عبد القادر بیدل کی ایک غزل نظر سے گزری جس کے جواب میں اسی زمین میں راقم نے چہار غزلہ کہا ہے پہلے بیدل کی غزل ملاحظہ ہو" (ولی)

بیدل کی غزل

بازم از فیض جنون آمادہ شد سامان صبح   می دہد چاک گریباں در کفم دامان صبح

از گداز پیکرم تعمیر امکان کردہ اند   آسمان وو دیعت از خاکستر تابان صبح

فتح باب فیض در رفع توہم خفتہ است   از شکست رنگ شب وا می شود مژگان صبح

در جنون وضع گریبانم تماشا کردنیست   ہمچو زخم دل نمک دارد لب خندان صبح

این قدر خون شہیدان در دم شمشیر تست   با شفق دارد بکف سررشتہ دامان صبح

ما بہ کلفت قانعیم اما ز بس کم فرصتی   شام ما ہم می زند پیمانۂ دوران صبح

تا نگردد کاسہ ات پر خون بہ رنگ آفتاب   آسمان مشکل کہ در پیشت گذارد نان صبح

تخم شبنم ریشۂ عبرت درین گلشن دواند   خندۂ توام می دمد با ریزش دندان صبح

ترک غفلت شاہد اقبال فیض ما بس است   چشم اگر از خواب وا شد نیست جز برہان صبح

تا بہ کی خواہد ہوس گرد خیال انگیختن   در نفس رفتہ است فرصت عرصۂ جولان صبح

حسن از ہر نالۂ عاشق نقابی می درد   نگسلی ربط نفس ای بلبل از افغان صبح

تخم اشکی می فشاند آہ واز خود می رود   غیر شبنم نیست بیدل زاد ہمراہان صبح

بازم از فیض جنون آمادہ شد سامان صبح   می دہد چاک گریبان در کفم دامان صبح

٭ دار الامان، ۲۷ فرنگی محل، لکھنؤ۔

غزل (۱)

از شبستان آمی بیرون ببین رُخ رخشان صبح — در گلستان گل بریزند از لبِ خندانِ صبح
عندلیبان نغمہ سنجی می کنند از شاخسار — در چمن هستند با من همزبان یارانِ صبح
شد منور از شعاعِ مہر پہنای جہان — نور می بارد ز روی روشن غلمان صبح
آسمان میدان جنگ است و شفق دریای خون — کشتہ شد اہر یمن شب از کفِ یزدانِ صبح
نور پاشی می شود از بام گردون بر زمین — شاہِ خاور رُو بر آرد از در ایوان صبح
با من آدر باغ و اعجاز بہاران را ببین — گوہر افشاند فلک از ابر بر دامانِ صبح
بعدِ مرگِ ہر شب از نور و تموزِ آفتاب — زندگی تازہ ای یابد تن بیجانِ صبح
نیست وقت خواب این رو در چمن بین شانِ حق — شاد خواہی شد چو بینی چہرۂ شادانِ صبح
رو بہ گلشن سبزہ و گل انتظارت می کشند — باش چندی در گلستان با ہمہ خاصانِ صبح
نیست نورِ آفتاب این ہہر طفل کائنات — ہر سحر گہ می چکد شیر از سر پستانِ صبح
صحبتِ ریحان و گل خوش آیدم گاہ سحر — وقت فرصت می گذارم با ہمہ خوبانِ صبح
بعدِ ہر شب جلوہ ای کان بر زمین آید پدید — بنگر از بام گردون دیدۂ حیرانِ صبح
از کجا پیدا شود رنگ شفق، نور سحر — بی شمار انجم نباشد ار ولی قربانِ صبح

غزل (۲)

ہم نوالہ گر نباشد میہمان بر خوان صبح — لقمہ ای دشوار باشد خوردنم از نان صبح
گریۂ وقتِ سحر از دل زداید التہاب — روز را تا شب خنک دارد نمِ بارانِ صبح
ہست چون از ذرہ ذرہ قدرت حق آشکار — در ثنای حق بشو مشغول چون مرغانِ صبح
مہ قندیل ورش باشد شفق تزئین در — غور کن کی ساخت است این قصرِ عالیشان صبح

کیست آن خلوت نشینِ قصرِ گردون کز ازل — آفتاب نور پیکر باشدش دربانِ صبح
از فریبِ صبح کاذب صبحِ صادق می دمد — در نگاہم نور کاذب ہم شود بُرہانِ صبح
در جدالِ زندگی پسپا شدی گر غم مخور — کی شود از لکۂ ابر سیہ کتمانِ صبح
ماہ و انجم زار بودند از ز دست کائنات — دادہ شد مہر درخشان صورت جبرانِ صبح
خواہرِ مرگ است خواب و مردگانِ خواب را — زندگی تازہ بخشد چشمۂ حیوانِ صبح
ساقیا وقت صبوحی نقل و می پیشم میار — من کہ بیزارم، نخواہم این ہمہ سامانِ صبح
دل چو غمگین است از ہر شی چکد رنج و ملال — نیست شبنم اشک می ریزند از مژگانِ صبح
صبح چون شد یافتم آن را بتر از شامِ غم — در شب تاریک بودہ در دلم ارمانِ صبح
بود چون قصرِ زلیخا تیرہ شب زندان مہر — لیک یوسف وار بر آمد ہمہ کنعانِ صبح.
اختتامِ شب چو لازم است در نظم جہان — ای ولی باشی چرا نومید از امکانِ صبح

غزل (۳)

آی و ببین در شرقِ گردون رونق میدان صبح — مہر غلطد بر فلک از ضربتِ چوگانِ صبح
شہدِ شادابی ترا داد از لب خندانِ صبح — نور باران می شود از چہرۂ تابانِ صبح
خرمن یاقوت و مرجان ریختہ شد بر فلک — باز شد گنجینۂ قارون از فیضانِ صبح
قطرہ ہای ژالہ می ریزند از ابرِ بہار — پُر شد است از کثرتِ گوہر ہمہ دامانِ صبح
شب گذشت و شد زمین رشک بہشت از فیضِ نور — آتشین رُخ می نماید مہر چون غلمانِ صبح
رو بہ صحن گلشن و بین قدرتِ حق آشکار — بہر خلوت نشین باشد ہمین فرمانِ صبح
رنگ و نورِ خندہ است این نیست سرخیِ شفق — بر شبِ یلدا ست خندہ زن رُخِ تابانِ صبح
ہست چون ہر سو نمایان قدرتِ پروردگار — جلوۂ حق را ندیدن باشدت عصیانِ صبح

پیشِ حق سجدہ نکردن بعد دیدن قدرتش　　ہست ہم کفرانِ نعمت، ہست ہم کفرانِ صبح

گشت از ورِ روشن جہان گردید رنگین آسمان　　گشتہ تازہ جسم و جان باشد ہمین احسانِ صبح

صبح واکی از نجوم و ماہ آرایش شود　　ہست زرین تختِ مہرِ نورِ زر اشایانِ صبح

مجلسِ شب را شکستہ در، برای آفتاب　　دیو تاریکی مقید گشت در زندانِ صبح

تا بکی بے خواب باشی ای ولی الآن خُسپ　　ہست ہنگامی خروسان می کنند اعلانِ صبح

غزل (۴)

شاہِ خاور رُو برآرد یا رُخِ تابانِ صبح　　یا ز خُلدِ جاودان سر می زند غلمانِ صبح

محوِ پروانہ انجم بی خبر زین امر ہست　　ہر شعاعِ مہر تیری در کفِ سلطانِ صبح

منظرِ شب ہر کہ ہست آن ماہ باشد یا نجوم　　بر کنارِ نیلِ گردون می کشد ترخانِ صبح

منبع نور است ماُنش چون بشکلِ آفتاب　　از غروبِ ماہ و انجم کی شود نقصانِ صبح

دانہ ہای انجم از دیدہ نہان گشتند زانک　　کاشت آن را در زمینِ آسمان دہقانِ صبح

خُنکی و نورِ سحر باشند ہر دو توامان　　گرم چون گردد قضاً باشد ہمان پایانِ صبح

دست قدرت داد ہر کس را بقدرِ ظرفِ او　　ہست ظلمت مالِ شب، نور ازل از آنِ صبح

ابتدائش چون شود با عیش، خوش باشد حیات　　از سحر تا شام باشد خنکیِ بارانِ صبح

از ازل باشند باہم ہر دو تا روزِ ابد　　بستہ است از نورِ مہرِ آسمان پیمانِ صبح

آرزوی شادمانی ہست ما را بعدِ غم　　دورِ تاریکی چو شد، ہستیم ما خواہانِ صبح

گوی نور و نار خورشید است بر گردون کہ ہست　　قُلہ یخ بستہ ای بر تیغ کوہستانِ صبح

داروی آزارِ جسم و روح گردد کار ہست　　این متاعِ بیش قیمت ہست در دکانِ صبح

گریۂ وقت سحر تاثیر دارد ای ولیؔ　　می شود بابِ اجابت باز از افغانِ صبح

مطبوعات جدیدہ

CENTRAL ASIA (ہسٹری، پالیٹکس اینڈ کلچر)، مرتبین جناب ریاض الاسلام قاضی اے، قادر اور جناب جاوید حسین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۸۲ قیمت ۵۰۰ روپے، ۲۵ امریکی ڈالر، پتہ: انسٹی ٹیوٹ آف سنٹرل اینڈ ویسٹ ایشیا اسٹڈیز یونیورسٹی آف کراچی، پاکستان۔

گذشتہ صدی کے اواخر میں ایشائے کوچک کی متعدد مسلم ریاستیں، سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد سیاسی طور پر تو آزاد ہو گئیں لیکن طویل عرصے کے ظالمانہ تسلط و استحصال کے اثرات ان تمام ریاستوں کے مذہبی و اخلاقی اور معاشرتی نظام میں سرایت کر چکے تھے جن کے تدارک کی فکر و کوشش میں عالم اسلام خصوصاً ان ریاستوں کے ہمسایہ مسلم ممالک سامنے آئے، کراچی یونیورسٹی کے ادارہ مطالعات مرکزی و مغربی ایشیا نے اسی مقصد سے ۹۳ء میں ایک بین الاقوامی مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا۔ حسن اتفاق سے اسی سال ادارہ کے قیام کے پچیس برس بھی پورے ہوئے تھے، اس سیمنار کے مقالات کو زیر نظر کتاب میں تاریخ، سیاست اور ثقافت کے ابواب کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ تاریخ کے ضمن میں برصغیر سے ان ریاستوں کے تعلقات پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ سیاسی مضامین خاص طور پر لائق ذکر ہیں جن سے اس خطہ کے مذہبی و معاشی احوال کی تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔ ایک مضمون BASMACHI تحریک کے قائد ابراہیم بیگ لوقائی پر بھی ہے جن کو ان کے رفقا سمیت ۳۲ء میں سزائے موت دی گئی تھی، تاجکستان میں ۱۹۸۵ء کے بعد سیاسی تغیرات اور اسلام کے موضوع کے متعلق تحریر بھی مفید معلومات پر مشتمل ہے، مرکزی ایشیا کی جغرافیائی سیاست پر جناب آغا شاہی کا مضمون گو مختصر ہے لیکن فکر انگیز ہے۔ تہذیب و ثقافت کے باب میں امام ترمذی،

رومی اور علی نوائی کے علاوہ برصغیر پر اس خطہ کے ثقافتی اثرات پر بہترین مقالات ہیں، قریب ۲۸ مقالات کا یہ مجموعہ ان مسلم ترکستانی ریاستوں کے متعلق مستند اور جدید ترین افکار و معلومات کا مرقع ہے، ادارہ کے بانی پروفیسر حسام الدین راشدی کی روح اس مفید سمینار سے مسرور ہوئی ہوگی، حکیم محمد سعید شہید کے مجموعہ حسنات میں یہ کاوش بھی شامل ہے کیونکہ اس سمینار کا انعقاد ان کی کوشش و توجہ سے ممکن ہوا، بجا طور پر یہ مجموعہ ان کے نام سے معنون ہے۔

PALESTINE DOCUMENTS از جناب ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۸۹۴، قیمت درج نہیں، پتہ: فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیوٹ لمیٹڈ، ڈی - ۸۴، ابوالفضل انکلیو-۱، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰۔

فلسطین اور اسرائیل کا قضیہ، موجودہ بلکہ پوری اسلامی تاریخ کے چند نہایت حساس اور اہم واقعات میں سے ہے۔ تقریباً ایک صدی سے خوں ریزی، تباہی، دربدری اور عزت و ذلت کی داستان جاری ہے، جس میں یہود کی قساوت و شقاوت کے ساتھ غیروں کی عیاری، دروغ گوئی، بدعہدی اور مکر و فریب کی بے شمار کہانیاں شامل ہیں، زیر نظر کتاب اسی قضیہ کے حقائق پر مشتمل ہے فاضل مصنف کو فلسطین کے موضوع سے خاص تعلق اور گویا درجہ اختصاص حاصل ہے، یہ کتاب بھی اسی تعلق اور برسوں کے مطالعہ و محنت کا نتیجہ ہے، جس میں اس قضیہ کی ابتدا سے اب تک تمام اہم واقعات کی دستاویزوں کو من و عن جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ خیال درست ہے کہ انگریزی زبان میں بھی یہ اپنی نوعیت کی پہلی کاوش ہے، شروع میں فلسطین کے متعلق جغرافی و عمرانی اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں، اس کے بعد یہودی فلسطین کے بارے میں ۱۸۹۷ء سے ہر واقعہ کی دستاویزی تفصیل دی گئی ہے، جمع و تدوین کے اس حد درجہ دشوار گزار مرحلے کو بڑی خوبی سے طے کیا گیا ہے، آخر میں چند اہم نقشے بھی ہیں، بے شبہ مسئلہ فلسطین کے بارے میں یہ ایسا مرجع و ماخذ ہے جس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اردو مخطوطات از خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۴۷۲، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ کے کارآمد اور باوقعت سمینار محتاج تعارف نہیں، مختلف علمی موضوعات پر یہ سمینار اور ان کے مطبوعہ مجموعے اہل علم و نظر کی داد و تحسین حاصل کرتے ہیں، زیر نظر مجموعہ مقالات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو ۱۹۸۳ء میں اردو مخطوطات کے موضوع پر ایک سمینار پٹنہ اور دہلی میں منعقد ہوا تھا، اس کے قریب پینتالیس مقالات کو اس مجموعے میں یکجا کیا گیا ہے۔ سنت کبیر کے الف نامے، شیخ فیض اللہ آزدی کے قصہ جم جم، مرآت صادق، سعادت یار خاں رنگین، جگت ظہور شاہ جہاں بانو، میر حسن وغیرہ کے نادر مخطوطات کے علاوہ برصغیر کے مختلف کتب خانوں اور انفرادی ذخیروں کے مخطوطات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں کتب خانہ دارالمصنفین کے دو مخطوطوں دیوان ریختی اور نخلخہ کا تعارف بھی ہے، محققین کے لئے یہ مجموعہ خاص طور پر بہت مفید و کارآمد ہے۔

متاع عقیدت از جناب تاج الدین اشعر رام نگری، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۶۸، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: مکتبہ تحفظ ملت، رام نگر، بنارس اور مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

نعتیہ اشعار کا یہ مبارک مجموعہ، بنارس کے ایک نسبتاً کم معروف لیکن خوش گو اور خوش فکر شاعر کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے والہانہ عقیدت و محبت کا آئینہ ہے، ان کے ممدوح شعراء جامی اور اقبال و ماہر القادری ہیں، اس حسن انتخاب کا عکس ان کے کلام میں جھلکتا ہے۔ ان کے ہر شعر میں سرشاری و بے خودی کی کیفیت ہے، تاہم وہ اس صنف مبارک کی نزاکتوں سے باخبر اور ہوشیار بھی ہیں۔ نعت گوئی میں یہ بڑی خوبی ہے اور خوشی ہے کہ یہ مجموعہ اسی خوبی کا آئینہ دار ہے۔

ع۔ ص۔

ssion-2000/01

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی

(پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت ۱۹۹۸ء میں قائم مرکزی یونیورسٹی)

نظامت فاصلاتی تعلیم

اعلان داخلہ۔ 2000-2001

اُردو ذریعۂ تعلیم اور فاصلاتی طریقے سے درج ذیل کورسوں میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ھیں:

ا. بی اے / بی کام / بی ایس سی سال اول میں داخلہ بذریعہ اہلیتی امتحان۔

رسمی تعلیمی قابلیت نہ رکھنے والے امیدواروں کو بی اے / بی کام / بی ایس سی میں داخلے کے لیے اہلیتی امتحان میں کامیابی حاصل کرنی ہوگی۔ یہ امتحان ملک کے منتخب مقامات پر 22 اکتوبر 2000 بروز اتوار منعقد ہوگا۔ امیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری 2001 کو اپنی عمر کے 18 سال مکمل کرلیں۔ اہلیتی امتحان کے لیے خانہ پری کی ہوئی درخواست مع رجسٹریشن فیس 100 روپے وصول ہونے کی آخری تاریخ 8 ستمبر 2000 ہے۔ تاخیر فیس 50 روپے (جملہ 150 روپے) کے ساتھ یہ فارم 19 ستمبر تک جمع کیے جاسکتے ہیں۔

2. بی اے / بی کام / بی ایس سی میں راست داخلہ

3. چھ ماہی سرٹی فکیٹ پروگرام برائے کمپیوٹنگ

کورس نمبر 2 اور 3 کے لیے ایسے امیدوار درخواست دینے کے اہل ہیں جنھوں نے کسی مسلمہ بورڈ/ادارے/یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ یا 2+10 یا ان کے مساوی امتحان میں کسی بھی ذریعہ تعلیم سے کامیابی حاصل کی ہو۔ انٹرمیڈیٹ کے مماثل قرار دیے گئے کورسوں کی فہرست پراسپکٹس میں شائع کی گئی ہے۔ خانہ پری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 دسمبر 2000 ہے۔

(بی ایس سی پروگرام صرف حیدرآباد، نظام آباد، بنگلور، گلبرگہ اور ممبئی میں اور کمپیوٹنگ پروگرام صرف حیدرآباد، کرنول، بنگلور، میسور، دہلی اور ممبئی میں دستیاب ہے)

4. چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے اہلیت اُردو بذریعہ انگریزی

5- چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے اہلیت اُردو بذریعہ ھندی

6- چھ ماہی سرٹیفکیٹ پروگرام برائے غذا اورتغذیہ

کورس نمبر 4، 5 اور 6 میں داخلہ کے لئے کسی رسمی تعلیمی قابلیت یا اہلیتی امتحان میں کامیابی کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ امیدواروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ یکم جنوری 2001 کو اپنی عمر کے 18 سال مکمل کرلیں۔ خانہ پری کی ہوئی درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 دسمبر 2000 ہے۔

یونیورسٹی اور اس کے پروگراموں سے متعلق تفصیلی معلومات پراسپکٹس میں فراہم کی گئی ہیں۔ پراسپکٹس مع درخواست فارم شخصی طور پر یا بذریعہ ڈاک نیچے دیے گئے پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یونیورسٹی کے علاقائی مراکز اور اسٹڈی سنٹروں پر پراسپکٹس مع داخلہ فارم نقد رقم ادا کرنے پر دستیاب ہے۔

بی اے / بی کام / بی ایس سی کورسوں کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت شخصی طور پر حاصل کرنے کی صورت میں 35 روپے اور بذریعہ ڈاک 40 روپے ہے۔ کسی بھی سرٹیفکیٹ کورس کے لئے پراسپکٹس مع درخواست فارم کی قیمت نقد 10 روپے اور بذریعہ ڈاک 15 روپے ہے۔ (بذریعہ ڈاک پراسپکٹس منگوانے کے لئے مطلوبہ رقم کا بینک ڈرافٹ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے نام اور حیدرآباد میں قابل ادا ہونا چاہیے۔ ڈاک سے داخلہ فارم منگوانے کے لیے ڈرافٹ صرف نیچے دیے گئے پتے پر ہی ارسال کریں۔)

ڈائرکٹر، ڈسٹنس ایجوکیشن، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، ڈیلکس کالونی، ٹولی چوکی، حیدرآباد 008 500

پروفیسر محمد سلیمان صدیقی، رجسٹرار

تصانیف مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

☆ اسوۂ صحابہؓ: (حصہ اول) اس میں صحابہ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق و معاشرت کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ — قیمت ۵۰ / روپے

☆ اسوۂ صحابہؓ: (حصہ دوم) اس میں صحابہ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ — قیمت ۵۵ / روپے

☆ اسوۂ صحابیاتؓ: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کردیا گیا ہے۔ — قیمت ۲۰ / روپے

☆ سیرت عمر بن عبد العزیز: اس میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی مفصل سوانح اور ان کے تجدیدی کارناموں کا ذکر ہے۔ — قیمت ۳۲ / روپے

☆ امام رازی: امام فخر الدین رازی کے حالات زندگی اور ان کے نظریات و خیالات کی مفصل تشریح کی گئی ہے۔ — قیمت ۳۵ / روپے

☆ حکمائے اسلام: (حصہ اول) اس میں یونانی فلسفہ کے ماخذ، مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ نظریات کی تفصیل ہے۔ — قیمت ۵۰ / روپے

☆ حکمائے اسلام: (حصہ دوم) متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ — قیمت ۳۰ / روپے

☆ شعر الہند: (حصہ اول) قدماء سے دور جدید تک کی اردو شاعری کے تغیر کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ۔ — قیمت ۹۳ / روپے

☆ شعر الہند: (حصہ دوم) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔ — قیمت ۵۰ / روپے

☆ اقبال کامل: ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح اور ان کے فلسفیانہ و شاعرانہ کارناموں کی تفصیل کی گئی ہے۔ — قیمت ۸۰ / روپے

☆ تاریخ فقہ اسلامی: تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں فقہ اسلامی کے ہر دور کی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔ — قیمت ۱۲۵ / روپے

☆ انقلاب الامم: سر تطور الامم کا انشاء پردازانہ ترجمہ۔ — قیمت ۵۵ / روپے

☆ مقالات عبد السلام: مولانا مرحوم کے اہم ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ — قیمت ۷۰ / روپے